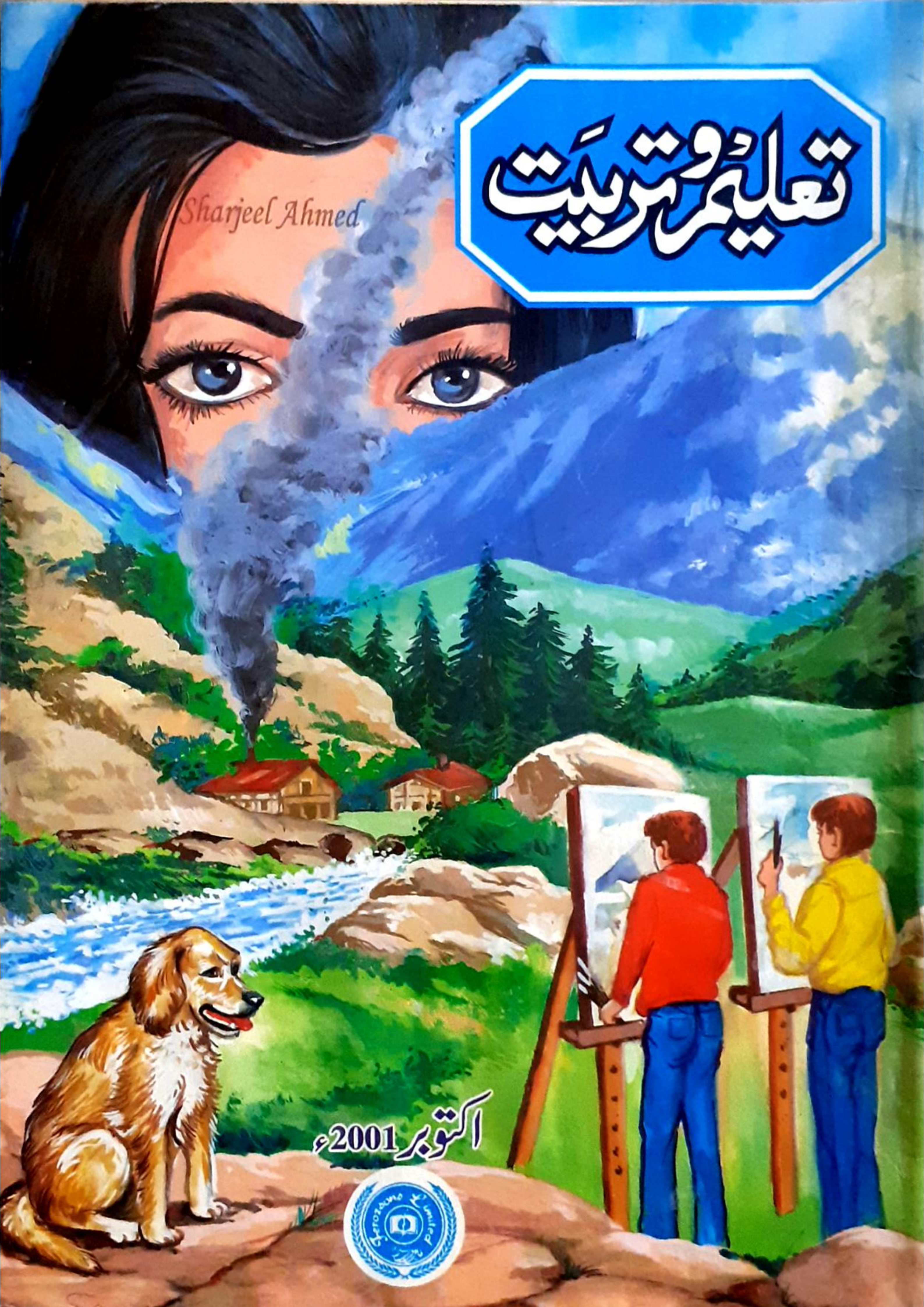

Sharjeel Ahmed

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

...6واں سال
...ساتواں شمارہ

سرکولیشن اسسٹنٹ	اسسٹنٹ ڈیزائننگ	خصوصی مشیر	سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	ایڈیٹر و پبلشر	چیف ایڈیٹر
محمد بشیر راہی	شوکت اعجاز	محمود حسن رومی	رضوان ثاقب	سعید لخت	ظہیر سلام	عبدالسلام

Sharjeel Ahmed

کہانی...... بڑی پرانی

"جو لوگ ہر کسی کو فریب دیتے ہیں وہ آخر کار خود بھی فریب کھاتے ہیں۔ فریب کی انتہا فریب ہی ہوتی ہے۔ دوسروں پر پتھر برسا کر ان سے پھولوں کی امید رکھنا حماقت ہے"۔ یوں تو یہ ایک بادشاہ سلامت کا قول ہے مگر اس قول پر مشتمل یہ کہانی حامد مشہود صاحب نے آپ کے لیے لکھی ہے۔ یہ کہانی کس قدر دل چسپ، پُر مزاح اور روح پرور ہے اس کا اندازہ آپ کو یہ کہانی پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے لہٰذا انتظار کیجئے......

صرف آیندہ ماہ کا!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

آج سے 50 سال پہلے پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو ایک بدبخت شخص نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ عظیم سانحہ 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی کے ایک جلسہ عام میں رونما ہوا۔ آپ پاکستانی قوم کے بہت باصلاحیت راہ نما اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے قابل اعتماد ساتھی تھے۔ پاکستانی قوم نے آپ کو شہید ملت کا خطاب دیا اور آپ کی شہادت کو نصف صدی گزر جانے کے باوجود پوری قوم کے دلوں میں آپ کی جدائی کا غم ابھی تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اسی مہینے آج سے 3 سال پہلے 17 اکتوبر 1998ء کو سندھ کے سابق گورنر اور بچوں کے معروف ادیب حکیم محمد سعید کو بھی چند شرپسندوں نے شہید کر دیا۔ آپ کا شمار دورِ حاضر کے بہترین طبیبوں اور ادیبوں میں ہوتا تھا۔ آپ ایک متحرک، فعال پُرعزم اور نہایت باصلاحیت شخصیت تھے۔

یہ تو صرف اکتوبر کے مہینے میں دہشت گردوں کی بھینٹ چڑھنے والی دو عظیم نہایت باصلاحیت اور عظیم شخصیات کی بات ہے اس کے علاوہ بھی بہت ساری نامور شخصیات دہشت گردی کا شکار ہو کر ہم سے جدا ہو چکی ہیں۔ دراصل پاکستان ہمارے دشمنوں کی آنکھوں میں کانٹا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ یہ ملک ترقی کرے اور خوش حال ہو۔ دشمن کی اسی گھناؤنی سازش کے نتیجے میں آئے دن دہشت گردی کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔

عزیز ساتھیو، دہشت گردی کو روکنے کے لیے آپ کے بڑے تو ٹھوس اقدامات کر رہے ہیں آپ کو بھی ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ کبھی کسی ناواقف سے کوئی چیز لے کر نہ کھائیں اور نہ ہی کسی اجنبی کے کہنے پر کوئی بریف کیس، تھیلا یا ایسی ہی کوئی چیز امانتاً اپنے پاس رکھیں اور اسی طرح کا کوئی لاوارث سامان پڑا ہوا آپ کو کہیں نظر آئے تو فوراً اپنے امی ابو یا اپنے استاد استانی کو بتائیں یا پھر پولیس کو اطلاع کریں۔ کوئی اجنبی آپ کو خواہ کیسا ہی لالچ کیوں نہ دے اس کی باتوں میں ہرگز نہ آئیں اور کبھی اس کے ساتھ نہ جائیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ اجنبی لوگوں سے اپنا میل جول بڑھائیں ہی نہ۔ کیوں کہ عزیز ساتھیو، آپ ہی اس قوم کا مستقبل اور عظیم سرمایہ ہیں، اس لیے آپ کو دشمن کی کسی سازش کا شکار ہونے یا دشمن کا آلہ کار بننے سے بچنے کے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ ایڈیٹر۔

اکتوبر 2001ء

قیمت فی پرچہ: 15 روپے
(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

سرورق: آپ ہی اپنے جال میں

اس شمارے میں

قائد ملت (نظم)	ضیاء الحسن ضیا	2
[illegible] (کہانی)	سید نظر زیدی	3
[illegible] (کہانی)	[illegible]	6
[illegible] (طویل لوک کہانی)	[illegible]	11
درس قرآن	[illegible]	16
[illegible] (سائنس فکشن)	[illegible]	17
[illegible] (کہانی)	[illegible] سعدی	24
[illegible] (لطائف)		31
کرکٹ کیا ہے (قسط 23)	ابن انشاء	32
[illegible] (کہانی)	محمد ادریس قریشی	36
[illegible]		40
آپ بھی لکھیے [illegible]		42
[illegible] (معلومات)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	46
چاند (نظم)	کرامت بخاری	48
آپ ہی اپنے جال میں (سرورق)	زبیدہ سلطانہ	49
لالچ کے [illegible] (کہانی)	محمد معروف چشتی	54
بزرگ بچے (کہانی)	مجید ظفر انور حمیدی	56
کارٹون کہانی	شاہد ریاض شاہد	58
[illegible]	حنا خیری	60
گلہری اور غزال (جنگلی حیات)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	63
باقی سب دلچسپ سلسلے حسب معمول		

قیمت سالانہ: پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) = /345 روپے
مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) = 750 روپے سالانہ
یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 830 روپے سالانہ
امریکا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 950 روپے سالانہ

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815 - 6278816 - 6361309 - 6361310

قائدِ ملتؒ

قائد ملت کی اونچی شان ہے
ان کا ملت پر بڑا احسان ہے

باعث شہرت ہے ان کی راستی
دیس کی خاطر شہادت پائی تھی

باعمل قائد نڈر تھے اور قوی
عزم میں ان کے نہ خم آیا کبھی

جذبہ قومی تھا ان کے قلب میں
پیار اور الفت تھے سچے قلب میں

جھوٹ سے نفرت سدا کرتے رہے
دیس کی خاطر بہت سے دکھ سہے

خون سے اپنے نکھارا دیس کو
نام روشن ان کا جگ میں کیوں نہ ہو

یہ دعا ہے کہ وطن پھولے پھلے
قبر پر ان کی خدا رحمت کرے

ضیاء الحسن ضیا

سچّی بہادری

سید نظر زیدی

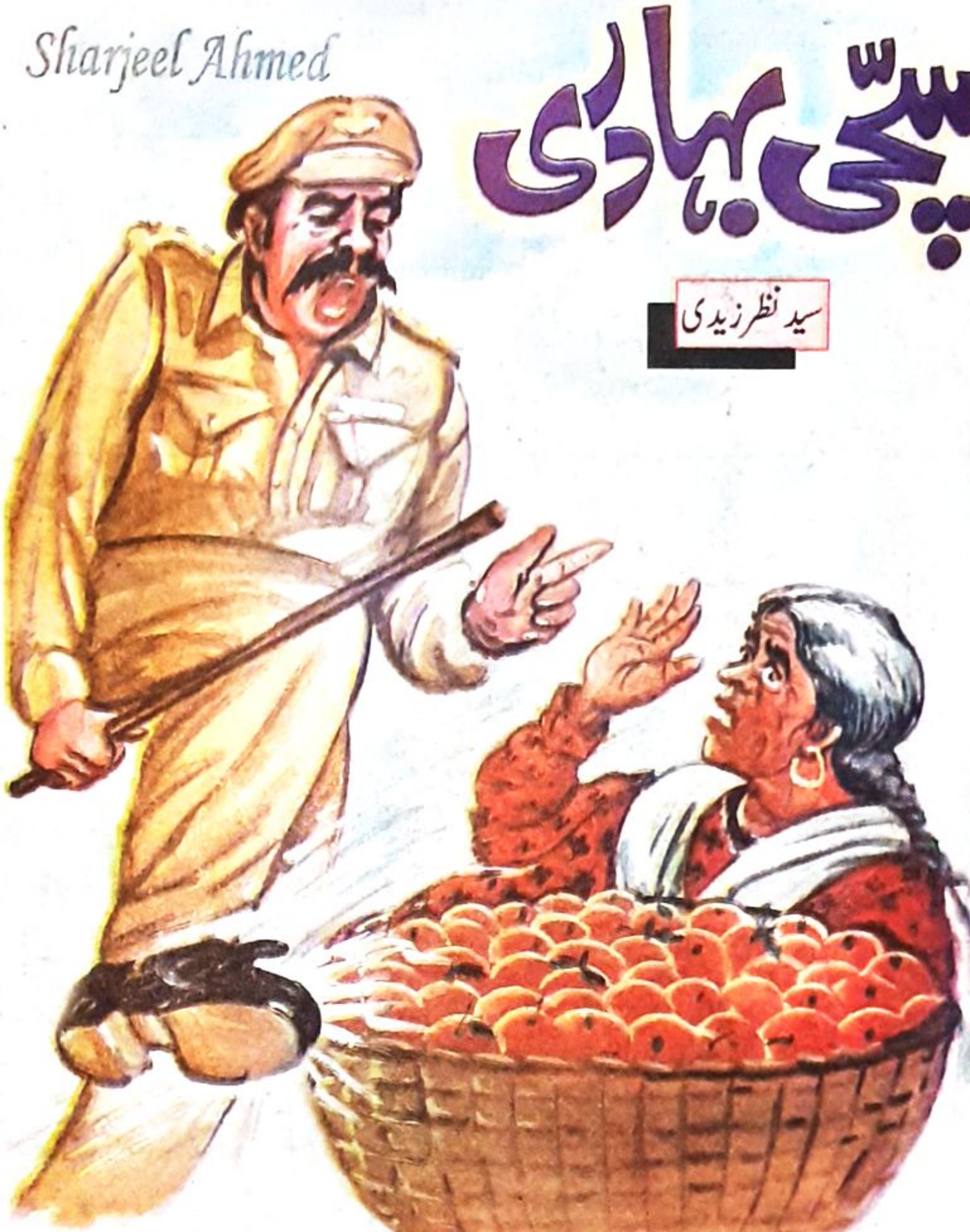

لگ بھگ 1918ء کی بات ہے شہر بمبئی (اب اسے ممبئی کہا جاتا ہے) کے اس علاقے میں جس میں یورپین اور امیر کبیر ہندوستانی رہتے تھے ایک بوڑھی مرہٹن عورت پھلوں کی ٹوکری سر پر رکھے ہوئے داخل ہوئی۔ پھلوں کی ٹوکری میں پھل تو زیادہ نہ تھے لیکن بوڑھی عورت تھوڑا سا بوجھ اٹھانے ہی سے بری طرح تھک گئی تھی۔ اس کی ٹوکری میں جو پھل تھے وہ اس قابل نہ تھے کہ امیروں کے اس محلے میں فروخت ہوتے۔ وہ دراصل یہاں سے گزر کر آگے غریبوں کے علاقے میں جایا کرتی تھی۔ بہت زیادہ تھک جانے کی وجہ سے وہ ایک جگہ رک گئی اور پھلوں کی ٹوکری سر سے اتار کر سڑک کے کنارے رکھ دی۔

بوڑھی عورت کو یہاں رکے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ پولیس کا ایک انگریز سارجنٹ وہاں آگیا اور غصے بھری آواز میں بولا۔ ”ویل بڑھیا تم ادھر کیا کر رہی ہو؟“

انگریز سارجنٹ کو دیکھ کر بڑھیا تھر تھر کانپنے لگی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”کچھ نہیں کر رہی حضور، تھک گئی تھی۔ ستانے کے لیے ذرا سی دیر کے لیے رک گئی ہوں، ابھی چلی جاؤں گی!“

انگریز سارجنٹ نے بڑھیا کی بات پر دھیان نہ دیا، نہ اسے اس کے ہاتھ جوڑنے پر ترس آیا...... آگے بڑھ کر اس نے پھلوں کی ٹوکری پر زور سے ٹھوکر ماری۔ ٹوکری دور جا گری اور سارے پھل سڑک پر بکھر گئے۔ غریب ڈری سہمی بڑھیا اپنے اس نقصان پر اونچی آواز میں رونے لگی۔ یہ تھوڑے سے پھل ہی اس کی زندگی کا سہارا تھے۔ انہیں بیچ کر جو دو چار آنے نفع ملتا اسی سے وہ کھانے پینے کا سامان خریدتی اور دوسرے دن مزدوری کرنے کے قابل بنتی۔

ادھر پھلوں کی ٹوکری الٹا کر بھی سارجنٹ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ بڑھیا کو دھکا دیتے ہوئے چلا کر بولا ”بھاگ جاؤ ادھر سے ورنہ چالان کر دے گا تیرا! جیل بھیج دے گا تجھے۔ خبردار جو آئندہ تو ادھر آیا!“

جس وقت انگریز سارجنٹ بڑھیا کو ڈانٹ رہا تھا ایک شریف صورت ہندوستانی عورت کسی قدر فاصلے پر کھڑی یہ ظلم

ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پھلوں کی ٹوکری الٹا کر سارجنٹ وہاں سے چلا جائے گا اور اس کے جانے کے بعد بڑھیا پھل سمیٹ کر اپنی ٹوکری اٹھا کر اپنی راہ لے گی۔ لیکن جب سارجنٹ اسے ڈانٹنے ڈپٹنے لگا تو وہ باوقار انداز میں چلتی ہوئی بڑھیا کے قریب آ گئی اور انگریز سارجنٹ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''مسٹر سارجنٹ' آپ کو اس غریب بڑھیا کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا جو آپ نے اس کے ساتھ کیا ہے!''

انگریز سارجنٹ نے بہت غصے سے خاتون کو گھورا اور اپنی آواز کو رعب دار بناتے ہوئے کہا ''ویل لیڈی' تم کون ہوتا ہے ہم کو ٹوکنے والا۔ اس بڑھیا نے جرم کیا ہے اور اب ہم اس کو جیل بھیجے گا''۔

خاتون نے بہت نفرت سے کہا ''کیا جرم کیا ہے اس نے؟ کیا سڑک کے کنارے بیٹھ جانا جرم ہے؟''

''اوئیں' یہ جرم ہے' یہ یورپین لوگوں کا علاقہ ہے کالا لوگ ادھر نہیں ٹھہر سکتا!'' سارجنٹ نے اونچی آواز میں کہا۔ ''تمہارا خیریت اسی میں ہے کہ تم ادھر سے فوراً چلا جاؤ۔ ورنہ ہم تمہارا بھی چالان کرے گا!''

سارجنٹ کی یہ بات سن کر خاتون کچھ دیر اس کی طرف اس طرح دیکھتی رہی جیسے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر نرم آواز میں بولی۔ ''مسٹر' آپ اپنے عہدے کا خیال رکھ کر بات کریں!'' خاتون نے یہ بات اب انگریزی زبان میں کہی۔

سارجنٹ اس خاتون پر اور رعب ڈالنا چاہتا تھا' لیکن اسے ایسی اچھی انگریزی بولتے دیکھا تو سٹ پٹا گیا۔ مودب ہو کر بولا۔ ''خاتون میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مناسب ہو گا آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ ان ذلیل لوگوں کو ٹھیک کرنے کا یہی طریقہ ہے''۔

''بالکل نہیں مسٹر سارجنٹ! اللہ نے کسی کو ذلیل پیدا نہیں کیا۔ کسی کا غریب یا کسی کا امیر ہونا اللہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ ذلیل وہ ہے جو دوسروں کو ذلیل سمجھتا ہے۔ یہ غرور کی بات ہے اور غرور اللہ کو پسند نہیں''۔ خاتون نے یہ بات بھی انگریزی زبان میں کی۔

سارجنٹ شرمندہ سا ہو کر بولا ''بہر حال اب اس معاملے کو ختم کیجیے۔ میں اس بڑھیا کو یہاں سے چلے جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ آپ دخل نہ دیتیں تو میں اس کا چالان کرتا''۔

خاتون مسکراتے ہوئے بولی۔ ''لیکن صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ اسے یہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دیں!''

''تو پھر اور کیا بات ضروری ہے؟'' سارجنٹ نے حیران ہو کر سوال کیا۔

خاتون نے اب کسی قدر رعب دار لہجے میں کہا ''ضروری بات یہ ہے کہ آپ سڑک پر بکھرے ہوئے سارے پھل اٹھائیں۔ انہیں صاف کر کے اس بوڑھی خاتون کی ٹوکری میں رکھیں۔ ٹوکری اٹھانے میں اس کی مدد کریں اور آپ نے اس کے ساتھ جو برا سلوک کیا ہے اس کی اس سے معافی مانگیں!''

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' سارجنٹ کا لہجہ بھی اب کسی قدر رعب دار تھا۔ شاید اسے یاد آ گیا تھا کہ میں انگریز بھی ہوں اور پولیس کا سارجنٹ بھی۔

''تو پھر میں آئی جی صاحب کو بتاؤں گی کہ پولیس میں ایسے لوگ نہیں ہونے چاہئیں جیسے آپ نے بھرتی کر رکھے ہیں اور اس کے بعد اس بوڑھی عورت پر ظلم کرنے کا مقدمہ عدالت میں لے جاؤں گی۔ مسٹر سارجنٹ' آپ تو شاید بات بھول گئے ہیں' لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی بند سب پولیس والے اس بوڑھی عورت سمیت ملک کے سب شہریوں کے نوکر ہیں۔ آپ کا کام شہریوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا اور دھکے دینا نہیں بلکہ ان کی خدمت کرنا ہے۔ ملک کے شہری ٹیکس دیتے ہیں تو آپ لوگوں کو وردیاں اور تنخواہیں ملتی ہیں۔ میں ایک بار پھر آپ سے کہہ رہی ہوں کہ سڑک پر بکھرے ہوئے پھل اٹھائیے' انہیں صاف کر کے ٹوکری میں رکھیے اور پھر اس خاتون کی مدد کیجیے کہ ٹوکری آسانی سے اپنے سر پر رکھ

لے اور ہاں اس سے معافی بھی مانگیے!" خاتون نے بہت رعب دار آواز میں کہا۔

انگریز سارجنٹ کچھ دیر تو گم سم خاموش کھڑا رہا' اس کے بعد آگے بڑھا اور سڑک پر بکھرے ہوئے پھل اپنے رومال سے صاف کر کے بوڑھی عورت کی ٹوکری میں رکھنے لگا۔

بوڑھی مرہٹن بہت حیران ہو کر یہ باتیں سن رہی تھی۔ انگریز سارجنٹ بکھرے ہوئے پھل صاف کر کر کے اس کی ٹوکری میں رکھنے لگا تو وہ جلدی سے اٹھی اور سارجنٹ کے پیر پکڑتے ہوئے پھر بولی۔ "صاحب جی! آپ رہنے دیں' اپنے پھل میں خود اٹھالوں گی۔ رہنے دیں صاحب جی' رہنے دیں!"

خاتون نے بڑھیا کو ڈانٹتے ہوئے کہا "تم پیچھے ہٹ جاؤ مائی' انہیں اپنا کام کرنے دو۔ تم جیسے لوگوں ہی نے ان کا دماغ خراب کیا ہے۔ جوتے بھی کھاتے ہو اور ان کی خوشامد بھی کرتے ہو!"

بوڑھی عورت جلدی سے پیچھے ہٹ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ خوف کی وجہ سے اس کا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سارجنٹ نے پھل ٹوکری میں رکھتے رکھتے سر اٹھا کر ایک نظر خاتون کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

زمین پر بکھرے ہوئے پھل زیادہ نہ تھے۔ انہیں جھاڑ پونچھ کر ٹوکری میں رکھنے کا کام ختم ہو گیا تو سارجنٹ نے سہارا دے کر بڑھیا کو کھڑا کیا۔ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ٹوکری اس کے سر پر رکھی۔ اس سے معافی مانگی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا خاتون کے پاس گیا۔

خاتون سارجنٹ کو یہ کام کرتے ہوئے بہت دل چسپی سے دیکھ رہی تھی۔ سارجنٹ اس کے قریب آیا تو مسکرا کر بولی۔ "میں سمجھتی ہوں آپ نے اپنی پوری زندگی میں یہی ایک اچھا کام کیا ہے!"

"میں بھی یہی خیال کر رہا ہوں۔ اور یہ نیک کام آپ کی مہربانی سے کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بوڑھی کم زور عورت کے ساتھ برا سلوک کرنا واقعی میری غلطی تھی"۔ سارجنٹ نے ٹھہر ٹھہر کر ایسی آواز میں کہا جس سے بہت ادب ظاہر ہوتا تھا۔

خاتون اب تعریف بھری نظروں سے انگریز سارجنٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو بہت شائستگی سے بولی۔ "مسٹر سارجنٹ' میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے اپنی غلطی محسوس کی اور ایک بہادر اور شریف آدمی کی طرح اس کا ازالہ کر دیا۔ میں آپ کو یقینی دلاتی ہوں کہ اب اس بوڑھی عورت کے دل سے آپ کے لیے دعائیں نکل رہی ہوں گی جو آپ کے بہت کام آئیں گی۔ شاید آپ اپنے محکمے کے بہت بڑے افسر بن جائیں"۔

"اور اگر ایسا ہوا تو میں سمجھوں گا کہ یہ عزت مجھے آپ

کی وجہ سے ملی ہے۔ اگر آپ بہت بہادری سے مجھے میری غلطی پر نہ ٹوکتیں تو میرے حصے میں اس عورت کی بد دعائیں آتیں اور پھر خدا جانے میرا کتنا نقصان ہوتا۔ آپ نے غریبوں پر ظلم نہ کرنے کی بات کی تو مجھے اپنی ممی کی نصیحت یاد آ گئی۔ وہ بھی یہی کہا کرتی تھیں کہ کمزوروں اور غریبوں کو کبھی نہ ستانا اور میں بڑھیا کے پھل ٹوکری میں رکھنے اور اس سے معافی مانگنے پر آمادہ ہو گیا"۔

"بہت خوب' اب ضروری بات یہ ہے کہ آپ اپنی ممی کی اس نصیحت کو ہر وقت یاد رکھیں اور لوگوں پر رعب گانٹھنے کے بجائے ان کی خدمت کریں۔ پولیس کا محکمہ شریفوں کی حفاظت کرنے اور مجرموں کو پکڑنے کے لیے قائم کیا گیا ہے"۔ خاتون نے بہت خوش ہو کر کہا۔

گیا۔ خاتون بھی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

بچو' کیا تم جانتے ہو یہ خاتون کون تھی؟ یہ تھی ہمارے قائداعظم محمد علی جناحؒ کی بیوی رتن بائی۔ بہت نیک دل اور غریبوں' کمزوروں کی ہمدرد ہونے کے علاوہ اس عظیم خاتون کی ایک بہت بڑی اچھائی یہ ہے کہ اس نے چھوٹی عمر میں دین اسلام کی خوبیوں کا مطالعہ کر کے یہ دین قبول کیا تھا اور بالغ ہونے کے بعد اپنی مرضی سے قائداعظمؒ کے ساتھ شادی کی تھی۔

رتن بائی بمبئی کے ایک بہت امیر پارسی سر ڈنشا پٹیٹ کی بیٹی تھیں۔ اللہ نے انہیں بہت اچھی شکل صورت کے ساتھ خوبیاں بھی بہت دی تھیں۔ انہیں بمبئی کا گلاب کہا جاتا تھا۔ ان کی قابلیت اور دانائی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے

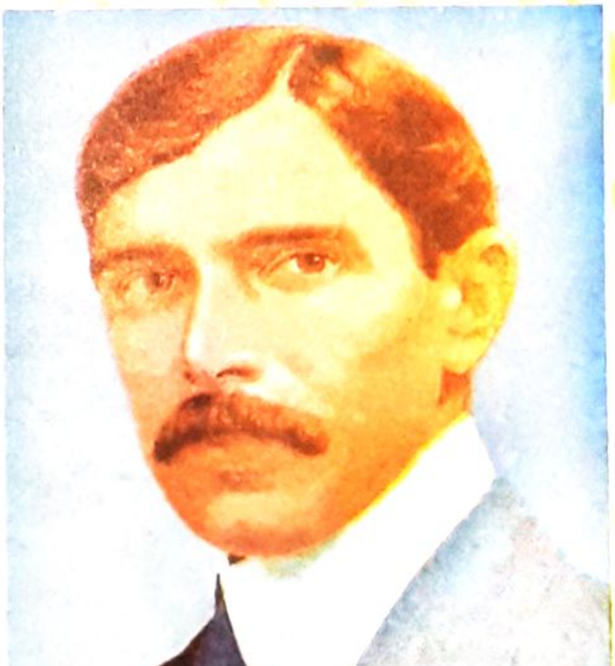

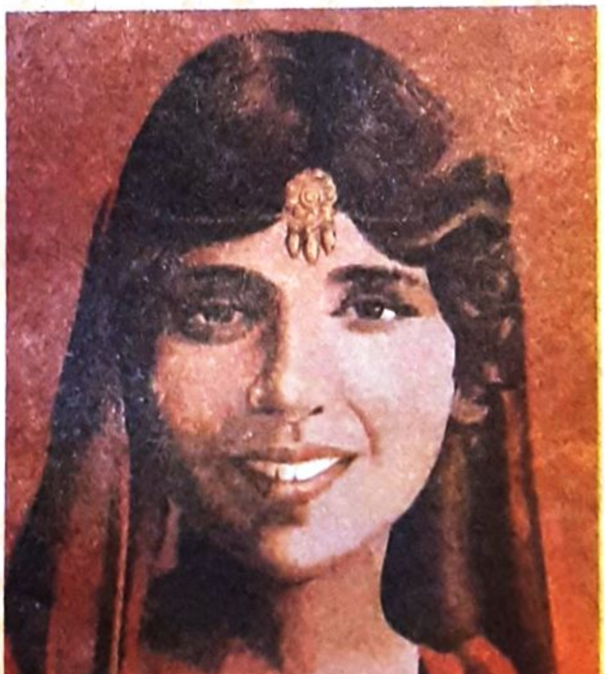

سارجنٹ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر سلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو میڈم تھینک یو" اور رخ بدل کر وہاں سے چلا

دین اسلام کی صداقت کا اندازہ کر کے یہ سچا دین اختیار کیا۔ قائداعظمؒ نے شروع زندگی میں جو شہرت اور کامیابیاں حاصل کیں ان میں رتن بائی کا نام بھی آتا ہے۔

Sharjeel Ahmed

کہنا بڑوں کا مانو

فوزیہ عباس

شہر کے سب سے بڑے نیشنل پارک میں لگے بے شمار چھوٹے بڑے درختوں میں سے پیپل کے ایک گھنے درخت پر آج خلاف معمول پرندوں کا کچھ زیادہ ہی جمگھٹا تھا۔ اس درخت پر بی چڑیا اور چڑے میاں کا گھونسلا تھا۔ جسے دیکھو رنگ برنگے کاغذوں میں لپٹے تحفے لیے ادھر ہی اڑا چلا جارہا تھا۔

"اوہو مٹھو تم سے کوئی کام جلدی بھی ہوتا ہے کیا' ایک چھوٹا سا تحفہ خریدنے گئے تھے بازار اور اتنی دیر لگا کر لوٹے ہو...... اچھا اب جلدی چلو پہلے ہی دیر ہو گئی ہے"۔ طوطی بیگم نے اپنے طوطے میاں کے ہاتھوں سے تحفہ لے کر میز پر رکھا۔

کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے طوطے میاں نے کہا۔ "ہاں ہاں چلو میں تو کب سے تیار ہوں' تمہارا ہی میک اپ ختم نہیں ہوتا"۔

"ارے واہ! میں کب کرتی ہوں میک اپ" طوطی بیگم نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پرفیوم چھڑکتے ہوئے کہا' پھر اپنا پرس اور تحفہ لے کر طوطے میاں کے ساتھ بی چڑیا کے گھونسلے کی جانب روانہ ہو گئی' جہاں پہلے ہی بہت سے مہمان پہنچ چکے تھے۔ درخت کی تقریباً ہر شاخ پر یہاں وہاں کوئی نہ کوئی پرندہ بیٹھا اپنی آواز میں چہچہا رہا تھا۔ ادھر کالا سوٹ پہنے کوا کائیں کائیں کر کے کبوتر سے حالات حاضرہ اور سیاست پر گرما گرم بحث کر رہا تھا تو ادھر کچھ فاصلے پر بیٹھی سفید میکسی والی کبوتری غٹرغوں غٹرغوں کر کے کوی بیگم سے اس کے بچوں کا حال احوال پوچھ رہی تھی۔

اصل میں کل بی چڑیا اور چڑے میاں کے انڈوں میں سے چار بچے نکلے تھے اور اسی خوشی میں انہوں نے اپنے سب رشتے دار اور دوست پرندوں کو مٹھائی بھیجی تھی تو آج وہ سب انہیں مبارک باد دینے آرہے تھے۔ بی چڑیا تو اپنی ایک ایک سہیلی کو گھونسلے میں لے جا کر پنگھوڑوں میں لپٹے لال سرخ' بے بال و پر بند آنکھوں والے بچے دکھا کر خوشی سے نہال ہوئی جا رہی تھی۔

"آنٹی ان کے نام کیا ہیں؟" بی مینا کی ننھی مینا نے جو اپنی امی کے ساتھ آئی تھی بچوں کو دیکھ کر پوچھا۔

"بیٹا ان کے نام چنیا' منیا' چنو اور منو ہیں" بی چڑیا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آہا اب تو میں ان کے ساتھ کھیلا کروں گی" ننھی مینا نے خوش ہو کر تالی بجائی۔

"ہاں ہاں مینا کیوں نہیں' جب یہ ذرا بڑے ہو جائیں گے تو پھر تمہارے ساتھ ضرور کھیلا کریں گے" بی چڑیا کر کہا۔

بی چڑیا اور چڑے میاں نے اپنے سب مہمانوں کی تواضع خوب کی۔ رات گئے سب پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹے۔

چار ننھے منے بچوں کی آمد سے بی چڑیا اور چڑے میاں کے سونے گھونسلے میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ شروع شروع میں تو دونوں کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا رہا۔ بی چڑیا خوراک کی تلاش میں نکلتی تو چڑے میاں خوشی خوشی بچوں کی دیکھ بھال کرتے اور وہ جاتے تو بی چڑیا بچوں کا خیال رکھتی' لیکن ان کی یہ خوشی زیادہ دن قائم نہ رہی۔ بچے بہت شریر تھے کسی طرح سنبھالے نہ جاتے تھے۔ سارا وقت ان چاروں کے شور اور اچھل کود سے گھونسلے میں ایک ہنگامہ مچا رہتا۔ چڑے میاں سے تو پھر بھی کچھ دبتے تھے مگر بی چڑیا کی ایک نہ

سنتے۔ بے چاری سمجھا سمجھا کر تھک جاتی، چنیا اور منیا کو لڑنے سے روکتی تو چنو منو لڑنے لگتے، چنو اور منو کو گھونسلے سے باہر جانے سے منع کرتی تو چنیا اور منیا پھدک کر کسی قریبی شاخ پر جا بیٹھتیں۔

"چنیا منیا دیکھو گھونسلے میں واپس آجاؤ، گر جاؤ گی"

بی چڑیا آخر ماں تھی خوف زدہ ہو کر کہتی۔

"ارے واہ ایسے ہی گر جائیں گے۔ ہمارے پر نہیں ہیں کیا"

منیا اپنے چھوٹے چھوٹے نامکمل پر پھیلا کر فخر سے کہتی تو بی چڑیا اس ہٹ دھرمی پر سر پیٹ لیتی۔ اس نے کئی بار انہیں سمجھایا تھا کہ ان کے یہ چھوٹے چھوٹے نامکمل پر ابھی انہیں اڑنے میں مدد نہیں دے سکتے مگر وہ ماں کی کہاں نہ مانتے تھے۔

ساتھ والے درخت پر بوڑھی فاختہ بی کا گھونسلا تھا۔ وہ جب دیکھتی کہ بچے ماں کو بہت ستاتے ہیں تو وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی، تب چنو بگڑ کر کہتا۔

"دیکھو بڑی بی، اپنے کام سے کام رکھا کرو، ہر وقت نصیحتیں نہ کرتی رہا کرو"

"اور نہیں تو کیا، ہمارا گھر ہے ہم چاہے گندا رکھیں یا جو مرضی کریں تمہیں کیا مطلب" چنیا بھلا کب پیچھے رہنے والی تھی، فوراً بول پڑی۔

"ارے بچو، میں تو تم ہی لوگوں کے بھلے کی بات کرتی ہوں، دیکھو ہر وقت کے شور ہنگامے اور گھونسلے میں فالتو کاغذ بکھیرتے ......"

"بس بس رہنے دو بڑی بی، تم تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہو" منو تیزی سے فاختہ بی کی بات کاٹ دیتا۔

ادھر بی چڑیا کو اپنے بچوں کی زبان درازی اور بدتمیزیوں پر سخت شرمندہ ہو کر کئی بار فاختہ بی سے معافی مانگنی پڑتی تھی۔ اس نے تو ان چاروں کی پیدائش پر بہت خوشی منائی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کے بچے بہت فرماں بردار اور اچھے ہوں مگر معاملہ الٹ تھا، اسے تو یہی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر یہ چاروں کس پر پڑے ہیں، میکے سسرال میں دور تک کسی کے ہاں ایسے شریر اور بدتمیز بچے نہیں تھے۔ بے چاری خود ہی کبھی انہیں سدھارنے کے طریقے سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی تو کبھی یہ سوچ کر خوف سے دہل جاتی کہ اگر بچے

بڑوں کی بات نہ مانیں تو ضرور نقصان اٹھاتے ہیں۔

اس دن موسم ابر آلود تھا، خوب گھرے بادل چھائے ہوئے تھے، اس لیے سر شام ہی اندھیرا پھیلنے لگا۔ گرمی کی شدت میں کمی کے باعث پارک میں تفریح اور پک نک کے لیے آنے والے بچوں بوڑھوں عورتوں اور جوانوں کا رش عام دنوں سے کچھ زیادہ تھا۔ جگہ جگہ لوگ ٹولیوں کی شکل میں کہیں گھوم پھر رہے تھے تو کہیں بیٹھے مزے مزے کے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے، کچھ بچے جھولوں سے چمٹے ہوئے تھے اور کچھ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے ہوئے ہنس کھیل رہے تھے۔ پیپل کے درخت پر بنے گھونسلے میں بیٹھی بی چڑیا نے اپنے بچوں سے کہا۔

"دیکھو بچو، آج موسم کچھ ٹھیک نہیں ہے، اندھیرا بڑھ رہا ہے اور اگر بارش بھی شروع ہو گئی تو رات کے کھانے کا مسئلہ ہو جائے گا، اس لیے میں ابھی کچھ انتظام کر کے آتی ہوں۔ تمہارے ابو بھی آج جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔ بس تم نے شور نہیں کرنا اور نہ ہی آپس میں لڑنا، ٹھیک ہے"۔

"جی امی، ہم بالکل نہیں لڑیں گے، آپ جائیں" چاروں نے ایک دوسرے کو شرارت بھری نظروں سے دیکھ کر جواب دیا۔

"شاباش! میرے بچے بہت اچھے ہیں"

بی چڑیا نے باری باری چاروں کو پیار کیا۔ وہ جانا تو نہیں چاہتی تھی کیوں کہ اپنے بچوں کی اس فرماں برداری کا مطلب خوب سمجھتی تھی مگر جانا بھی ضروری تھا کیوں کہ دن میں بھی وہ سر میں درد کی وجہ سے نہیں گئی تھی اور چڑے میاں جو کچھ لائے تھے وہ سب نے دن میں ہی کھاپی لیا تھا۔ اس لیے اگر اب بھی وہ نہ جاتی تو رات کو سب کھاتے کیا؟ دونوں خود تو بھوکے رہ سکتے تھے مگر بچوں کو بھوکا سلانا انہیں منظور نہیں تھا۔ یہی سوچ کر اس نے خوراک کی تلاش میں نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

موسم بے حد ابر آلود تھا' شہر کے سب سے بڑے اور خوب صورت نیشنل پارک میں لگے بے شمار چھوٹے بڑے درختوں میں سے پیپل کے اس گھنے درخت پر ایک بار پھر پرندوں کا جمگھٹا تھا' جس پر بی چڑیا اور چڑے میاں کا گھونسلا تھا۔ جسے دیکھو اداس غم گین ادھر ہی اڑا چلا جارہا تھا۔

"توبہ ہے مٹھو' کبھی تو کوئی کام ڈھنگ سے کر دیا کرو' تمہیں چینی لانے کو کہا تھا تم نمک اٹھا لائے ہو' جاؤ جلدی سے چینی لے کر آؤ۔ بی چڑیا اور چڑے میاں کے گھر چوری لے کر جانی ہے' ہائے ہائے کیسی قیامت ٹوٹی ہے بے چاروں پر' چار ہنستے کھیلتے بچے منٹوں میں ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ ایسے میں کھانے پکانے کا ہوش بھلا کسے رہتا ہے۔ چوری لے جاؤں گی تو دونوں کچھ کھالیں گے"۔

طوطی بیگم نے طوطے میاں کے ہاتھ میں نمک کا لفافہ پکڑا کر چینی لانے کی تاکید کرتے ہوئے دکھ سے کہا۔ اور پھر کچھ دیر بعد طوطی بیگم نے چوری بنائی اور اپنے طوطے میاں کے ساتھ بی چڑیا کے گھونسلے کی جانب روانہ ہوگئی جہاں پہلے سے درخت کی تقریباً ہر شاخ پر کوئی نہ کوئی پرندہ بیٹھا اپنے اپنے انداز میں دکھ کا اظہار کر رہا تھا۔ دونوں وہاں پہنچے تو دیکھا' درخت پر گھونسلے کا کہیں نام نشان نہ تھا۔ بی چڑیا اور چڑے میاں غم سے نڈھال ایک شاخ پر بیٹھے تھے' طوطی بیگم نے آگے بڑھ کر بی چڑیا کو گلے سے لگا لیا اور بہت دیر تسلیاں دیتی رہی۔

"ہونا کیا تھا' کچھ دیر پہلے ماں بہت لاڈ پیار سے سمجھا کر گھر سے نکلی تھی کہ شور نہ کرنا اور نہ ہی آپس میں لڑنا' میں رات کے کھانے کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں"۔

کچھ دیر بعد طوطی بیگم نے بوڑھی فاختہ بی کو کسی کو بتاتے سنا۔

"مگر چاروں نے ماں کی نصیحت ایک کان سے سنی دوسرے سے نکال دی اور اس کے گھونسلے سے نکلتے ہی وہ اودھم مچایا کہ بس کچھ نہ پوچھو' میں سامنے اپنے گھونسلے میں بیٹھی سب دیکھ رہی تھی' منع کیا تو کہنے لگے:

"بڑی بی' تمہیں تو ہمارا ہنسنا بولنا بھی پسند نہیں ہے' پتا نہیں کب تم سے جان چھوٹے گی......"

بوڑھی فاختہ بی نے کچھ دیر رک کر سانس درست کیا اور پھر دوبارہ بولی۔

"تم دیکھ رہی ہو نا آج پارک میں کتنا رش ہے۔ طرح طرح کے لوگ آ جا رہے ہیں' انہی میں وہ شریر لڑکا بھی شامل تھا جس کا مشغلہ ہی معصوم پرندوں اور جانوروں کو تنگ کرنا ہے۔ حال آں کہ ان کے مذہب میں تو جانوروں اور پرندوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور انہیں ستانے اور ان پر ظلم کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے مگر یہ لڑکا اکثر غلیل ہاتھ میں پکڑے اس پارک میں آجاتا ہے۔ آج بھی اس کے ایک ہاتھ میں پتھر اور دوسرے میں غلیل تھی اور وہ درختوں پر کچھ تلاش کرتا اس طرف آنکلا تھا۔ وہ ان چاروں کے شور کی آواز سن کر رک گیا۔ میں نے انہیں خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر چاروں نے میری ایک نہ سنی۔ اسی دوران میں لڑکے نے تاک کر گھونسلے کا نشانہ لیا' دیکھتے ہی دیکھتے گھونسلا بچوں سمیت نیچے جا پڑا اور تنکا تنکا ہو کر بکھر گیا' بچے بھی اتنی بلندی سے گرتے ہی مر گئے۔ شریر لڑکا اپنے نشانے کی کام یابی پر خوش ہوتا اچھلتا کودتا واپس مڑ گیا۔ کچھ دیر بعد قریبی جھاڑیوں سے ایک بلی نکلی اور چاروں بچوں کو کھا گئی"۔

بوڑھی فاختہ بی اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی تو طوطی بیگم نے ایک بار پھر آنسو بہاتی بی چڑیا کو گلے سے لگا لیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش ان نادان بچوں نے اپنی ماں اور فاختہ بی کی بات مانی ہوتی تو آج ان کا یہ انجام نہ ہوتا۔

Sharjeel Ahmed

بلوچی لوک کہانی

مچھیرن

سلیم خان گمی

مکران کے ساحل پر ایک مچھیرا رہتا تھا۔ اس کا گھر کیا تھا بس جھونپڑا تھا جسے مچھیرن صاف ستھرا رکھتی تھی لیکن وہ لالچ کی ماری ہوئی تھی۔ ہمیشہ یہی کہتی کہ ہم بہت غریب ہیں۔ کاش ہم امیر ہو جائیں۔ اس کا شوہر لالچی نہ تھا۔ وہ مچھلیاں پکڑنے کے لیے روزانہ صبح سویرے سمندر میں جاتا اور جال ڈال کر مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ اس کا جال پھٹا پرانا تھا اور اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ پھٹے پرانے جال کی مرمت کر لیتا۔ اس کے کئی ساتھی امیر تھے اور میر بحر کہلاتے تھے لیکن لوگ اسے مچھیرا اور ماہی گیر ہی کہتے تھے۔ اس کے کپڑے پھٹے رہتے جن میں وہ اپنی بیوی سے کہہ کر پیوند لگوا لیتا۔ کئی بار تو اس کے جال میں کچھ نہ آتا اور وہ دونوں میاں بیوی بھوکے ہی سوتے۔ ایسی صورت حال میں مچھیرن گلے شکوے کرتی اور اپنے خاوند اور قسمت کو کوستی، منہ بسورتی، گالیاں دیتی، شور مچاتی اور خاوند سے لڑ کر سو جاتی۔

ایک دن وہ مچھلیاں پکڑنے کے لیے ساحل پر گیا۔ جال سمندر میں ڈالا اور مچھلیوں کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی مچھلی جال میں نہ آئی۔ جب وہ جال نکال کر جانے والا تھا تو خوش قسمتی سے اس کے جال میں ایک مچھلی پھنس گئی اور جال میں ہلچل مچ گئی۔

"ارے! یہ کیا؟ لگتا ہے بڑی مچھلی پھنس گئی ہے۔ کہیں کوئی بڑا سمندری کچھوا تو نہیں؟ ڈور کو کھینچ کر دیکھوں، مچھلی ہے یا کچھوا؟ مچھلی ہے تو کتنی بڑی ہے۔ ایک دن کے لیے کافی ہو گی یا چار پانچ دن کے لیے اس کے گوشت سے لطف اٹھائیں گے۔ آؤ آؤ پیاری مچھلی آ جاؤ، قابو آ جاؤ، جال توڑ کر نہ بھاگ جانا، خالی ہاتھ گھر گیا تو بیوی بہت ناراض ہو گی۔ آسمان سر پر اٹھا لے گی۔ اچھی مچھلی لڑو مت"۔

اس نے جال پانی سے باہر نکالا اور دیکھا، مچھلی بہت بڑی تھی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ دونوں میاں بیوی ایک ہفتے تک مچھلی کھا کر خوب عیش کر سکیں گے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے کان میں آواز آئی "میر بحر! مجھے نہ مارو، مہربانی کرو، مجھے چھوڑ دو"

"یہ کہاں سے آواز آئی؟" اس نے سوچا اور پھر بولا۔

"میں بہت بھوکا ہوں۔ بھوک کے مارے میرے کانوں میں آوازیں آ رہی ہیں۔ کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ سمندر کے پانی سے آواز آئے یا مچھلی کو زبان مل جائے اور وہ انسانوں کی طرح گفت گو کرے۔ میرا خیال ہے مجھے ابھی اسی وقت مچھلی کے ٹکڑے کر لینا چاہئیں۔ ان ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا اچھاڑی سے

لکڑیاں لے کر بھون لینا چاہیے اور کھا لینا چاہیے تاکہ بھوک مٹ جائے اور کانوں میں آوازیں نہ آئیں"۔

"میر بحر' میر بحر' مجھے ٹکڑے ٹکڑے نہ کرو۔ میں عام مچھلی نہیں ہوں۔ میں تو ایک شہزادہ ہوں جس پر پانی میں رہنے کے لیے جادو کیا گیا ہے۔ ایک چڑیل نے مجھ پر جادو کیا تھا اور اب مجھے ہمیشہ کے لیے مچھلی بن کر سمندر کے پانی کے نیچے تیرتے رہنا ہے۔ مجھے جانے دو مہربانی ہو گی' خدا کے لیے مجھے پانی میں چھوڑ دو"۔

"ارے! یہ تو مچھلی بول رہی ہے۔ کہتی ہے میں شہزادہ ہوں۔ لیکن روپ مچھلی کا دھارا گیا ہے۔ آؤ مچھلی میں تمہارے منہ سے جال کا کانٹا نکالوں' مجھے معاف کرنا۔ مجھے پتا نہ تھا کہ تو شہزادہ ہے۔ اگر پتا ہوتا تو میں تجھے دکھ نہ پہنچاتا۔ یہ لو میں نے کانٹا تیرے منہ سے نکال دیا اور اب تجھے پانی میں پھینکتا ہوں' آہستہ سے"۔

یہ کہ کر ماہی گیر نے بڑی مچھلی کو آہستہ سے سمندر میں دھکیل دیا اور وہ فوراً لہروں کے نیچے چھپ گئی۔ وہ گھر آیا اور اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ اس نے ایک بڑی مچھلی پکڑی تھی جس نے بول کر اسے بتایا کہ وہ شہزادہ ہے اور کسی چڑیل نے اس پر جادو کیا ہے۔ اس کی بیوی کو سخت غصہ آیا اور مچھیرے پر برس پڑی۔

"تو بالکل احمق آدمی ہے' خالی ہاتھ گھر آ گیا ہے۔ گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ تیری ٹوکری میں وہ بڑی مچھلی ہوتی۔ ہائے میں مر گئی! اب ہم اس ساحل پر بیٹھے پتھر چاٹیں گے؟"

"بیوی! میں نے بتایا نا وہ مچھلی نہ تھی' شہزادہ تھا۔ اس پر چڑیل نے جادو کیا تھا' اس لیے میں نے اسے سمندر میں چھوڑ دیا"۔

"تو احمق ہے۔ اگر وہ شہزادہ تھا تو اسے کہتے کہ وہ تجھے کوئی چیز دے دیتا۔ اگر وہ مچھلی تھی اور اس پر جادو کیا گیا تھا تو اسے زندہ چھوڑنے کے لیے معاوضہ مانگ لیتا۔ میں اس جھونپڑے میں بیٹھی بھوکوں مر رہی ہوں' میرا ہی خیال کیا ہوتا۔ تم اسی وقت ساحل پر جاؤ اور اسی مچھلی کو پکڑ کر لاؤ"۔

"کیوں؟ وہ کس لیے؟"

"اگر اسے پکڑ لو اور وہ جان کی امان مانگے تو تم اس سے کہو کہ وہ ہمیں ایک خوب صورت گھر بنا دے جس کے ارد گرد پھولوں کی کیاریاں ہوں۔ ان کیاریوں میں پھول کھلے ہوں۔ گھر کے ساتھ تالاب ہو جس میں راج ہنس اور بطخیں تیر رہی ہوں۔ اور ایک کھیت بھی ہو جس میں گائے اور اس کا بچھڑا ہو۔ اب جاؤ' میرا منہ کیا تک رہے ہو"۔

مچھیرا جال لے کر ساحل کی طرف چل دیا۔ وہ اب اس مچھلی کو پکڑنا نہ چاہتا تھا۔ وہ اسے ایک بار پکڑ کر چھوڑ چکا تھا۔ اب دوبارہ اس کے منہ میں کانٹا چبھونا نہیں چاہتا تھا۔ چناں چہ اس نے ساحل پر کھڑے ہو کر مچھلی کو آواز دی اور اس وقت تک آواز دیتا رہا جب تک مچھلی تیر کر اس کے پاس نہ آئی۔

"پیاری مچھلی' تم تیر کر آ گئی ہو' اللہ کرے ہم سب کا بھلا ہو' میری بیوی بے حد لالچی ہے یوں کرو اسے کوئی تحفہ دو"۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں آپ کی بیوی کو کیا تحفہ دوں؟"

"اس نے تو کہا تھا کہ میں آپ کو دوبارہ پکڑ لوں لیکن میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتا۔ یہ تو میری بیوی ہے جس نے مجھے پھر یہاں بھیج دیا ہے۔ وہ چاہتی ہے میں آپ سے کوئی انعام لوں، کوئی معاوضہ لوں۔ حال آں کہ میں ایسا نہیں چاہتا"۔

"وہ کیا چاہتی ہے؟"

"وہ چاہتی ہے کہ اسے ایک بنا بنایا خوب صورت گھر مل جائے۔ گھر کے ارد گرد کیاریاں ہوں۔ ان کیاریوں میں گلاب کے پھول کھلے ہوں۔ گھر کے ساتھ تالاب ہو، تالاب میں راج ہنس اور بطخیں ہوں۔ گھر کے ساتھ ایک کھیت ہو اور کھیت میں گائے اور اس کا بچھڑا ہو"۔

"میر بحر! گھر جاؤ، ابھی اسی وقت آپ کی بیوی جیسا گھر چاہتی ہے اسے مل گیا ہے" یہ کہہ کر مچھلی سمندر کی لہروں میں تیر کر دور چلی گئی اور مچھیرا اپنے جھونپڑے کی طرف لوٹ آیا۔

وہاں جھونپڑے کی جگہ ایک خوب صورت گھر تھا جس کے دروازے کے سامنے مچھیرن کھڑی مسکرا رہی تھی۔ گھر کے ارد گرد گلاب کے پھولوں سے بھری پری کیاریاں تھیں۔ تالاب میں خوب صورت راج ہنس اور بطخیں تیر رہے تھے۔ کھیت ہرا بھرا تھا جس میں گائے اور اس کا بچھڑا کھڑے جگالی کر رہے تھے۔

"آہا! آپ آ گئے" مچھیرن خوش ہو کر بولی "میں نے کہا تھا نا کہ اگر آپ مچھلی سے کچھ مانگیں گے تو مچھلی آپ کو ضرور انعام دے گی۔ شرط یہ تھی کہ اس سے کوئی چیز مانگی جائے۔ میں اب بہت خوش ہوں۔ اب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، یہاں رہوں گی"۔

گھر واقعی بہت شان دار تھا۔ لیکن لالچی مچھیرن زیادہ عرصہ خوش نہ رہ سکی۔ اس نے اپنے شوہر سے شکایت کی کہ گھر کے کمرے چھوٹے اور تنگ ہیں۔ گھر کا فرنیچر زیادہ نفیس اور شان دار نہیں ہے، پرانا لگتا ہے۔ جدید طرز کا ہونا چاہیے۔ اس نے مچھیرے سے کہا۔

"ساحل پر جاؤ اور اس مچھلی کو پھر پکڑو۔ اسے بتاؤ کہ ہمیں بہتر گھر کی ضرورت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہمیں قلعہ مل جائے اور نوکر چاکر ہوں"۔

"بیوی، یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ مچھلی نے تو پہلے ہی ہمیں بہت اچھا گھر دیا ہے۔ پھولوں کی کیاریاں ہیں، تالاب ہے، کھیت ہے اور کیا چاہیے"۔

"اوہو کیا ہو گیا ہے تجھے؟ تو میری بات کیوں نہیں مانتا۔ جاؤ اور مچھلی کو پکڑو۔ جب اس کے خوب صورت نتھنے میں کانٹا ہو گا تو تم جو چاہو گے مچھلی آپ کو پیش کرے گی"۔

مچھیرا اپنی لالچی بیوی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ساحل پر گیا اور اسے پہلے کی طرح آواز دی۔ پہلے تو سمندر کا پانی نیلگوں تھا اس بار پانی کا رنگ کالا ہو گیا۔ پہلے پانی صاف تھا اس بار پانی گدلا ہو گیا۔ تاہم مچھلی تیر کر ساحل پر آ گئی۔

"پیاری مچھلی! تم تیر کر آ گئی ہو، اللہ کرے سب کا بھلا ہو، میری بیوی بے حد لالچی ہے، اس کا تحفہ اب بدل دو"۔

''آپ کی لالچی بیوی اب کون سا تحفہ چاہتی ہے؟''

''وہ اپنے موجودہ گھر سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ قلعہ چاہتی ہے''۔

''آپ واپس گھر جائیں۔ قلعہ آپ کا انتظار کر رہا ہے''۔

مچھیرا پلٹ کر گھر کی طرف چل دیا۔ جس جگہ اس کا گھر تھا وہاں اب شان دار قلعہ کھڑا تھا۔ قلعے کے دروازے پر پاسبان کھڑے تھے۔ وہ سب ہتھیار بند تھے۔ نوکر چاکر اور خادم کھانے پکانے کے برتن صاف کرنے کپڑے دھونے اور دوسرے کاموں کے لیے موجود تھے۔ مچھیرن بہت خوش تھی۔ لیکن مچھیرا پہلے کی طرح سادہ لباس اور پرانے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ اس کی حالت پہلے کی سی تھی۔ شان دار قلعے میں مچھیرا نوکروں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ مچھیرن کا طور طریقہ شاہانہ تھا۔ اس کا زیادہ وقت باورچی خانے میں نوکروں کے ساتھ گزرتا تھا اور وہ ان کو ڈانٹ کر بہت خوشی محسوس کرتی تھی۔

ایک دن مچھیرن کم خواب کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سر پر ریشمی چادر تھی۔ پیروں میں شاہی جوتی تھی۔ کانوں میں سونے کے جھمکے تھے۔ گلے میں ہیرے جواہرات کا ہار تھا۔ ماتھے پر ٹکہ تھا۔ کلائیوں میں سونے کے کنگن اور چوڑیاں تھیں۔ معلوم ہوتا تھا ملکہ چل پھر رہی ہے۔ اس نے خاوند کو بلوایا اور طنزیہ انداز میں بولی۔

''اپنے آپ کو دیکھو' اس قلعہ کے مالک ہو اور عام نوکروں کا لباس پہن کر عام نوکر نظر آتے ہو'' پھر بولی۔ ''خیر' تمہاری مرضی' میں نے اس وقت آپ کو اس لیے بلوایا ہے کہ ایک بار پھر ساحل پر جاؤ اور کانٹوں والا جال ساتھ لے جاؤ۔ وہاں جا کر اسی مچھلی کو پکڑو۔ میرا اب اس قلعہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ یہ قلعہ میرے لیے بہت چھوٹا ہے۔ میں سارے مکران کی ملکہ بننا چاہتی ہوں۔ جاؤ اور اس مچھلی کو پکڑو''۔

مچھیرا کانٹوں والا جال لے کر سمندر کی طرف چل دیا۔ ساحل پر کھڑے ہو کر اس نے سوچا کہ جال ڈالنے سے پہلے مجھے مچھلی کو پکارنا چاہیے۔ چناں اس نے مچھلی کو آواز دی اور کہا کہ میری بیوی نے آپ کو پھر یاد کیا ہے اور وہ آپ سے مزید تحفہ مانگتی ہے۔

''بتایئے آپ کی بیوی اب مجھ سے کیا چاہتی ہے؟''

''وہ چاہتی ہے کہ اسے مکران کی ملکہ بنا دیا جائے''۔

ابھی مچھیرے نے بات ختم کی تھی کہ سمندر میں جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا ہوئی۔ سمندر کا پانی کالا اور سرخ ہو گیا اور اس پر دھند تیرنے لگی۔

''مچھیرے! گھر واپس جاؤ۔ تمہاری بیوی ملکہ بن گئی ہے''۔

مچھلی کالے اور سرخ پانی کی لہروں میں چھپ گئی اور مچھیرا جال کندھے پر ڈالے گھر کی طرف چل دیا۔ اس نے دیکھا کہ پہلے جس جگہ قلعہ تھا وہاں اب عالی شان محل ہے۔ خوب صورت بارہ دریاں ہیں۔ غلام گردشوں میں نوکر چاکر چاق و چوبند کھڑے ہیں۔ امرا و وزرا زرق برق لباس پہنے چل پھر رہے ہیں۔ اردگرد باغ ہیں۔ باغوں میں پھول کھلے ہیں اور فوارے چل رہے ہیں۔ سازندے ساز بجا رہے ہیں۔ گلوکار تانیں اڑا رہے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے سفیر آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں اور ان کی آمد و رفت کا اعلان نقارے اور بگل بجا کر کیا جا رہا ہے۔ شہزادے اور شہزادیاں محل کے اندر اور باہر اٹھکیلیاں کر رہے ہیں۔ محل کے سب سے بڑے کمرے میں سنہری تخت ہے جس پر مچھیرن بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ ریشم و کم خواب میں پروقار نظر آتی ہے اور اس کے سر پر ہیرے جواہرات سے سجایا گیا سنہری تاج ہے۔ وہ واقعی ملکہ بلکہ ملکہ عالیہ بن چکی ہے۔ شہزادے' شہزادیاں وزیر اور سفیر اس کے سامنے جھکے کھڑے ہیں۔

مچھیرا اب مچھیرن سے دور ہی رہتا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ اس کے سامنے نہ آئے۔ وہ نہایت سادگی سے زندگی گزار رہا تھا۔ بمشکل ہفتہ گزرا ہو گا کہ مچھیرن نے اسے بلوایا۔ وہ جانا تو نہ چاہتا تھا لیکن اس نے مناسب نہ سمجھا کہ انکار کرے۔ جب وہ اس کے سامنے گیا تو فوراً پہچان گیا کہ اس کی بیوی خوش نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر وہی کیفیت تھی جو اس وقت پیدا

ہوتی تھی جب وہ مچھیرے سے گلہ شکوہ کرتی تھی یا ناراض ہوتی تھی۔

"آپ نے مجھے بلوایا ہے بیگم"۔

"مجھے بیگم نہ کہو"

"کیا کہوں آپ جناب کو؟"

"میں ملکہ ہوں، مجھے ملکہ کہہ کر پکارو"

"بہت اچھا، کیا بات ہے ملکہ بلکہ ملکہ عالیہ؟"

"میں سخت ناخوش اور غیر مطمئن ہوں"۔

"مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تم ملکہ ہو، تمہارے پاس محل ہے، محل میں نوکر چاکر ہیں، ہر قسم کا آرام ہے، لشکر ہیں، دولت کے ڈھیر ہیں...... اور کیا چاہیے اب؟"

"بے وقوف نہ بنو، ادھر دیکھو...... دائیں بائیں نہیں اوپر آسمان کی طرف"

"کیوں؟ کیا ہے؟ سورج ہے اوپر"۔

"ہاں، آسمان پر سورج ہے۔ یہ روزانہ اپنی مرضی سے چڑھتا اور ڈوبتا ہے۔ یہی حال چاند کا ہے۔ وہ بھی اپنی مرضی سے چڑھتا اور چھپتا ہے۔ میں شہزادے شہزادیوں امرا اور وزرا کو کیا کروں؟ چاند اور سورج تو میری بات نہیں مانتے۔ میں چاہتی ہوں وہ بھی میری بات سنیں اور مانیں۔ تم جاؤ اور سمندر کی جادوئی مچھلی کو پکڑو، اسے بتاؤ کہ میں اس وقت تک خوش نہ ہوں گی جب تک چاند سورج زمین اور آسمان میرا حکم نہ مانیں گے، جاؤ"۔

"لیکن...... لیکن...... یہ مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے"۔

"چھوٹے آدمی! میرے ساتھ بحث نہ کرو۔ جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل ہو۔ جاؤ"۔

پھر مچھیرن نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اسے سمندر تک لے جائیں اور چھوڑ کر آئیں۔ جب ہتھیار بند سپاہی مچھیرے کو چھوڑ کر آگئے اور وہ اکیلا رہ گیا تو اس نے سمندر کے پانی کو دیکھا جو بہت کالا اور بہت سرخ تھا۔ اس میں موجیں اٹھ رہی تھیں جن کا شور کانوں کو بہرہ کر رہا تھا۔ اس گھن گرج کے باوجود مچھیرے نے زور زور سے مچھلی کو پکارا۔

"مچھلی! پیاری مچھلی، آؤ آؤ میری لالچی بیوی کو نیا تحفہ دو"

سمندر کی موجوں نے طوفان اٹھایا۔ ان کا شور آسمان تک پہنچنے لگا۔ اچانک مچھلی قوس اور کمان کی طرح پانی سے ابھر کر اوپر آئی اور زور سے بولی۔

"بد بخت انسان، گھر جاؤ۔ تمہاری بیوی کو وہ کچھ مل گیا ہے جس کی وہ حق دار ہے"۔

مچھیرا کندھے پر جال ڈالے واپس گھر آیا، کیا دیکھتا ہے کہ سامنے وہی جھونپڑا ہے جس میں وہ اور اس کی بیوی امیر ہونے سے پہلے رہتے تھے۔ وہاں نہ محل ہے اور نہ نوکر چاکر امرا وزرا اور شہزادے شہزادیاں ہیں۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹی مچھیرن کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

زندگی کے باقی دن ان دونوں نے اسی جھونپڑے میں گزارے۔

انسان گنوار ہے یا مہذب...... اس بات کا خاصا اندازہ اس کے انداز گفت گو سے بھی ہو جاتا ہے۔ اچھے اور مہذب انسان بڑی عمدگی سے گفت گو کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں گفت گو کی عمدگی پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً دیکھئے دوسری سورہ کی آیت نمبر 83 کے درمیانی الفاظ:

قولوا للناس حسنا

لوگوں سے عمدگی سے بات کرو!

قرآن مجید میں بری آواز کو گدھے کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض لوگوں کا انداز گفت گو ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی لڑ جھگڑ رہا ہو۔ کرخت آواز اور بے ہنگم گفت گو دل و دماغ پر برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس کے برعکس اچھے لہجے کی معقول گفت گو بہت موثر ثابت ہوتی ہے۔

بہترین آواز کی بہترین مثال قرآن کریم کی آیات ہیں۔ اگر کوئی خوش الحان قاری تلاوت کر رہا ہو تو ساری کائنات وجد میں آتی معلوم ہوتی ہے۔ دنیا میں آج تک جتنی آوازیں سنائی دی ہیں ان میں سب سے شیریں آواز قرآنی آیات کی آواز ہے، جسے پڑھنے اور سننے والا دونوں ایک بے مثال لطف سے محظوظ ہوتے نظر آتے ہیں۔ اگر سننے والے کو دل میں اتر جانے والے قرآنی الفاظ کے معنے بھی آتے ہوں تو لطف اندوزی اور اثر پذیری میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

بجا ہے کہ ہر آواز قرآنی آواز کی مانند سریلی اور موثر نہیں ہو سکتی تاہم یہ کوشش تو ہر کوئی کر سکتا ہے کہ اس کا انداز گفت گو زیادہ سے زیادہ شائستہ اور مہذب ہو تاکہ وہ دوسروں کو بور اور بیزار نہ کرتا پھرے۔

Sharjeel Ahmed

سائنس فکشن

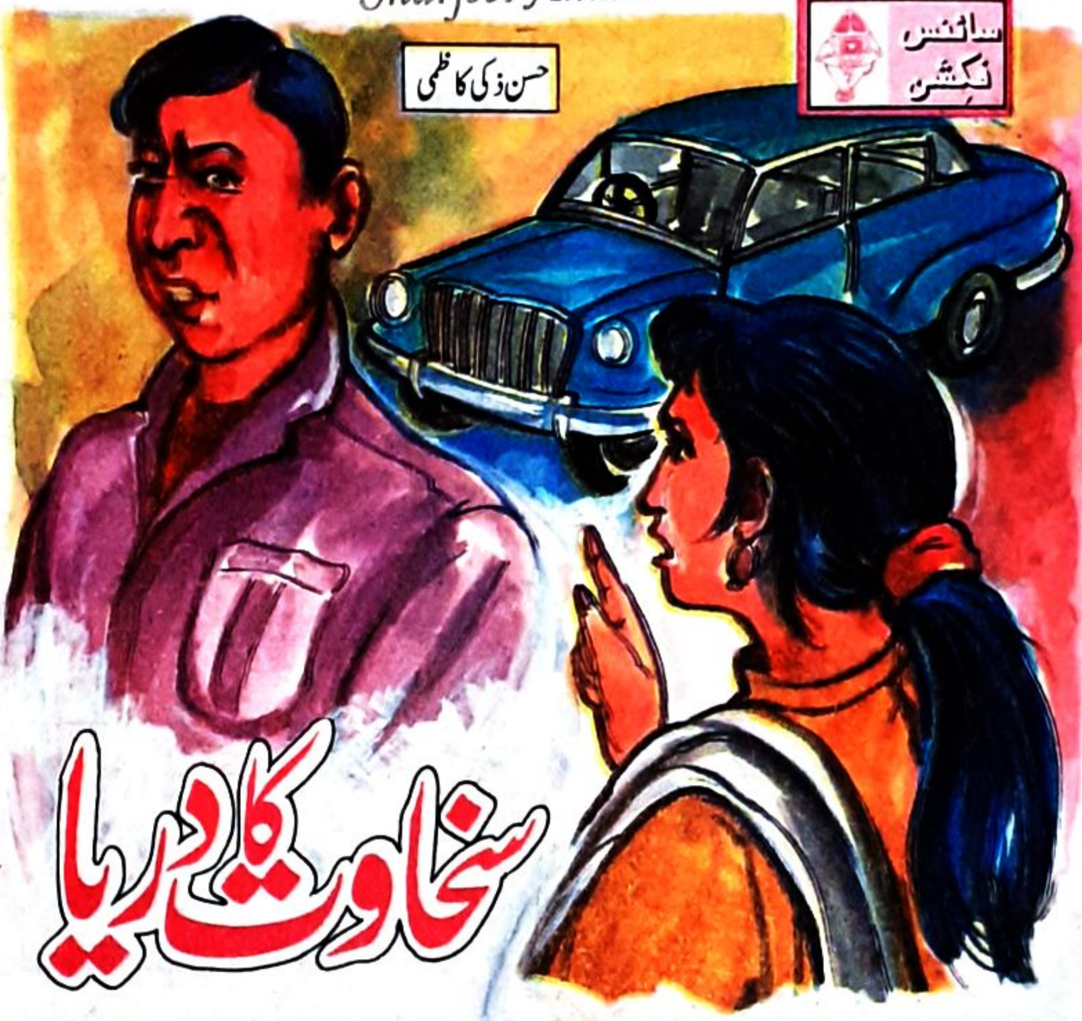

سخاوت کا دریا

حسن ذکی کاظمی

مرزا احمد علی کار کے انجن سے آدھا گھنٹا سر کھپانے کے بعد واپس گھر میں داخل ہوئے تو بیگم نے فقرہ کسا۔

"مرزا صاحب! دس مرتبہ کہا کہ 1857ء کے اس کھٹارے کو اب چلتا کیجئے اور نئی گاڑی لے لیجئے۔ دفتر کو دیر بھی ہوئی اور اب ٹیکسی کا کرایہ بھی خرچ کرنا پڑے گا"۔

مرزا صاحب کو پہلے گاڑی پر غصہ آرہا تھا اب بیگم پر برس پڑے۔

"تم پیسے دے دو نئی گاڑی کے لیے اگر بڑی ہم دردی ہے، میرے پاس تو اتنی رقم ہے نہیں...... بات دراصل یہ ہے کہ گھر میں ایک کوڑی نہ بچے، بیوی کا ہاتھ کھلا ہو تو کھٹارا ہی سے کام چلانا پڑے گا"۔

جمیلہ نے طنزیہ قہقہ لگایا اور بولیں۔ "اوہو، بیوی کا ہاتھ کھلا ہو، میں کہتی ہوں اللہ وہ دن تو لائے۔ رہی یہ بات کہ آپ کے پاس نئی گاڑی خریدنے کی رقم نہیں ہے، تو مرزا صاحب ایسی بھی ناشکری نہ کیجئے۔ اللہ نے آپ کو اتنا دیا ہے کہ دس گاڑیاں خرید لیں لیکن ہاں دل چھوٹا سا دے دیا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ دل بڑا کیجئے اور کچھ خرچ بھی کیا کیجئے اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہیے"۔

مرزا صاحب نے جل کر کہا۔ "بہت بہت شکریہ آپ کا، اپنے مشوروں کو اپنے پاس ہی رکھئے"۔

جمیلہ نے دوسرا قہقہ لگایا اور بولیں۔ "ٹھیک ہے تو پھر جائیے اور محلے کے لڑکوں کو جمع کر کے گاڑی کو دھکا لگوایئے"۔

مرزا نے زور سے ہونہہ کہا اور دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔

ان کی کنجوسی کی شہرت دور دور تک تھی۔ گو کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا اور جائداد بھی اچھی خاصی تھی لیکن خود بھی زندگی بھر ترستے رہے اور بیوی بچوں کو بھی ترساتے رہے۔ جمیلہ کا دل چاہتا تھا کہ اللہ نے اتنا دیا ہے تو بچوں کو اچھے اسکول میں پڑھوائے، ان کی ہر ضرورت اور خواہش پوری کرے اور ایسے عزیزوں اور غیروں کی مدد کرے جو پریشان ہیں۔ خود اپنی بھی اس کی بہت سی خواہشیں تھیں لیکن مرزا گھر کا خرچ ایسا ناپ تول کر دیتے تھے کہ وہ دل مار کر رہ جاتی تھی۔ بہر حال دن کسی نہ کسی طرح گزر رہے تھے اور جمیلہ کو یہ اطمینان تھا کہ مرزا صاحب اپنے کاروبار سے خوش ہیں۔

کاروبار میں اتار چڑھاؤ تو رہتا ہی ہے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ مرزا صاحب کو ایک سودے میں نقصان ہو گیا۔ یہ گھاٹا بہت زیادہ تو نہیں تھا لیکن مرزا کے لیے اسے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ اس گھاٹے سے وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ کچھ ہی دن میں یہ پریشانی ڈپریشن میں بدل گئی۔ اب کیا تھا، مرزا کی تو یہ حالت

ہو گئی کہ نہ کام میں دل لگتا تھا نہ کسی سے ملنے کو دل چاہتا تھا۔ ہر بات کا برا پہلو دیکھنے لگے۔ دماغ پر ہر وقت یہ خوف طاری رہتا کہ یہ کام بگڑ جائے گا وہ آفت آجائے گی۔ بیوی بچے دوست عزیز سب سمجھاتے ہمت بندھاتے لیکن مرزا کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ بس اب بربادی ہی بربادی ہے۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ ہی دن بعد مرزا کو ایک دوسرے سودے میں خوب فائدہ ہوا۔ سارا گھاٹا پورا ہو گیا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ منافع ہوا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ ان کی ذہنی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اب ہر وقت انہیں یہ خوف رہتا کہ کہیں پھر نقصان نہ ہو جائے۔ وہ سوچتے کہ اگر کوئی بڑا نقصان ہو گیا تو ساری جمع پونجی ختم ہو جائے گی اور وہ کنگال ہو جائیں گے۔ یہ مرض ایسا بڑھا کہ مرزا صاحب پر دواؤں کا اثر ہونا بھی بند ہو گیا۔ ایک دن لندن سے جمیلہ کے بھائی شہریار کا ٹیلی فون آیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"جمیلہ! احمد علی کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

جمیلہ نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا۔ "بس بھائی جان وہی بات ہے کہ جوں جوں دوا ہو رہی ہے مرض بڑھتا جا رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا"۔

شہریار بولے۔ "گھبراؤ نہیں اللہ مالک ہے۔ دراصل آج میں نے تمہیں فون ہی اس لیے کیا ہے کہ تم احمد علی کو لے کر فوراً کچھ دن کے لیے لندن آجاؤ۔ یہاں ایک نیا علاج دریافت ہوا ہے جس سے ڈپریشن خوف اور وہم کے کافی مریضوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ علاج بھی ہو جائے گا اور آب و ہوا بھی تبدیل ہو جائے گی۔ وہاں تو آج کل گرمی بھی بہت ہو گی اور ہمارے احمد علی ائر کنڈیشنر تو کیا پنکھا چلانے میں بھی کنجوسی کرتے ہوں گے"۔

پریشانی کے باوجود جمیلہ کو بھائی کے اس جملہ پر ہنسی آگئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ "بھائی جان' آپ خود سوچیے کہ جب وہ ائر کنڈیشنر اور پنکھا چلانے میں کنجوسی کرتے ہیں تو پھر لندن آنے جانے کا خرچ اور علاج کا خرچ برداشت کرنے پر کیسے تیار ہوں گے؟"

شہریار بھی ہنس دیئے اور بولے۔ "ہاں ہے تو بہت مشکل کام انہیں تیار کرنا۔ لیکن کوشش کر دیکھو۔ اور اگر بالکل نہ مانیں تو مجھے فون کرنا۔ میں خود انتظام کر لوں گا"۔

شام کو مرزا دفتر سے لوٹے تو چائے پی کر خاموش بیٹھ گئے جیسے سخت بیزار ہوں۔ جمیلہ نے بات شروع کی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے بھائی جان کا فون آیا تھا"۔

مرزا نے کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن چند لمحے بعد بولے "سب خیریت ہے؟"

جمیلہ نے کہا "ہاں اللہ کا شکر ہے۔ آپ کی خیریت معلوم کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ذرا لندن آجائیں۔ آب و ہوا بھی تبدیل ہو جائے گی اور کچھ علاج بھی ہو جائے گا"۔

مرزا تھوڑا سا موڈ میں آئے اور بولے۔ "واہ بھئی واہ' ذرا لندن آجائیں۔ ذرا ایسے کہا جیسے لاہور سے اسلام آباد جانا ہو۔ لندن جانا نہ ہوا مذاق ہو گیا۔ اور پھر وہاں علاج بھی کراؤ۔ علاج مفت میں ہوگا؟"

جمیلہ نے سوچا کہ مرزا اس وقت تھوڑا سا موڈ میں ہیں لہٰذا اسی وقت ان سے ہاں کرا لی جائے۔ کہنے لگیں۔ "مفت میں کیوں ہوگا' اس پیسے سے ہوگا جو بنک میں رکھا ہے اور اسی پیسے سے لندن کے ٹکٹ بھی آئیں گے۔ کوئی پیسا آپ کی جان سے زیادہ تھوڑا ہی ہے"۔

مرزا نے بات کاٹی اور ہنس کر بولے۔ "بس بس بس......اب آگے یہی کہو گی کہ پیسا ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ پیسا جان کا صدقہ ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دیکھو بھئی جمیلہ بیگم' میں تو دھیلا خرچ کرنے والا نہیں۔ تمہیں اگر بہت ہمدردی ہے مجھ سے تو اپنے پاس جمع کی ہوئی رقم نکالو"۔

جمیلہ نے قہقہہ لگایا اور بولیں۔ "اچھا وہ رقم جو آپ نے رکھوائی تھی میرے پاس؟"

مرزا صاحب بیوی کے طنز کو سمجھ گئے۔ ویسے بھی موڈ پھر کچھ بگڑنے لگا تھا لہٰذا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جمیلہ نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس وقت انہیں آرام کرنے دے۔

مرزا کے ڈپریشن میں جب بھی کمی ہوتی جمیلہ انہیں سمجھاتیں کہ اگر انہوں نے لندن سے علاج نہ کروایا اور یہی حالت رہی تو کاروبار پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ یہ بات مرزا کے دماغ میں بیٹھتی گئی اور آخر وہ دن بھی آگیا کہ مرزا صاحب اور جمیلہ لندن روانہ ہوگئے۔

لندن میں مرزا صاحب اور جمیلہ نے خوب سیر بھی کی اور مرزا صاحب کا علاج بھی ہو گیا۔ شہریار نے ان کے آرام کا بہت خیال رکھا اور خوب خاطریں کیں۔ مرزا واپس وطن پہنچے تو بالکل ہی بدلے ہوئے تھے۔ ڈپریشن کا دور دور پتا نہیں تھا۔ ملنا جلنا بھی پہلے کی طرح شروع کر دیا اور دفتر میں بھی دل لگا کر کام کرنے لگے۔ البتہ مرزا کی کنجوسی میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ اب تو خرچ اور بچت کے موضوع پر بیوی کو زیادہ لیکچر دینے لگے تھے۔

"جمیلہ بیگم! میری بات تو خیر تم کم ہی سنتی ہو لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ ذرا ہاتھ روک کر خرچ کرو"۔

جمیلہ جل کر کہتی۔ "ہاتھ چلا ہی کب ہے جو اس بے چارے کو روکوں۔ آپ نے تو اپنے ہاتھ کے ساتھ سارے گھر والوں کے ہاتھ باندھ لیے ہیں"۔

مرزا سمجھانے کے انداز میں کہتے۔ "بھئی میں یہ پیسا قبر میں تھوڑا ہی لے جاؤں گا۔ تم ہی لوگوں کے کام آئے گا۔ میرا مطلب ہے لندن میں جو مزے کئے ہیں اب اس کے بدلے میں یہاں بچت بہت ضروری ہے"۔

جمیلہ ہنس کر خاموش ہو جاتیں۔ شوہر سے یہ نوک جھونک تو چلتی ہی رہتی تھی لیکن اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ ان کا لندن کا سفر کامیاب رہا اور مرزا کو صحت ہو گئی۔ ان کی زندگی پہلے کی طرح معمول پر آگئی تھی۔

مرزا کی واپسی کے بعد سے دوست احباب اور عزیزوں کے ہاں روز دعوتیں ہو رہی تھیں اور مرزا ہر جگہ اس آلے کا ذکر کرتے تھے جو لندن میں ان کے سینہ میں لگایا گیا تھا اور جس پر ان کی بہت بڑی رقم خرچ ہو گئی تھی۔ مرزا صاحب علاج اور آلے سے زیادہ زور اس رقم پر دیتے تھے جو انہوں نے اس سلسلہ میں خرچ کی تھی۔

ماچس کی ڈبیا کے برابر کا یہ آلہ بیسویں صدی کے آخر میں مرگی کے مریضوں کے لیے ایجاد کیا گیا تھا۔ اس آلے کو مریض کے سینے میں جلد کے نیچے پیوست کر دیا جاتا ہے اور ایک باریک تار کے ذریعے اسے گردن کی ایک ایسی رگ سے جوڑ دیا جاتا ہے جو دماغ کے اس حصے کو جاتی ہے جس کا تعلق مزاجی کیفیت یا موڈ سے ہے۔ آلے میں ہلکی ہلکی برقی لہریں پیدا ہوتی ہیں جو آلے سے تار کے ذریعے گردن کی رگ میں اور پھر رگ کے ذریعے دماغ میں پہنچتی ہیں اور مریض کا موڈ ٹھیک کر دیتی ہیں۔ اس آلے کو سینے میں لگانے میں ایک گھنٹے سے بھی کم لگتا ہے۔ یہ آپریشن خطرناک بالکل نہیں ہوتا۔ آلہ لگنے کے بعد مریض کو کوئی بے چینی یا تکلیف نہیں ہوتی اور اگر فرض کیجیے کہ کوئی تکلیف ہو تو یہ آلہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے۔ یہ آلہ بنا تو مرگی کے مریضوں کے لیے تھا لیکن تجربہ کے دوران میں پتا چلا کہ اس سے مرگی کے دوروں کو تو بہت فائدہ نہیں ہوا البتہ اس کی برقی لہروں سے مریض ہشاش بشاش ہو جاتا تھا۔ چناں

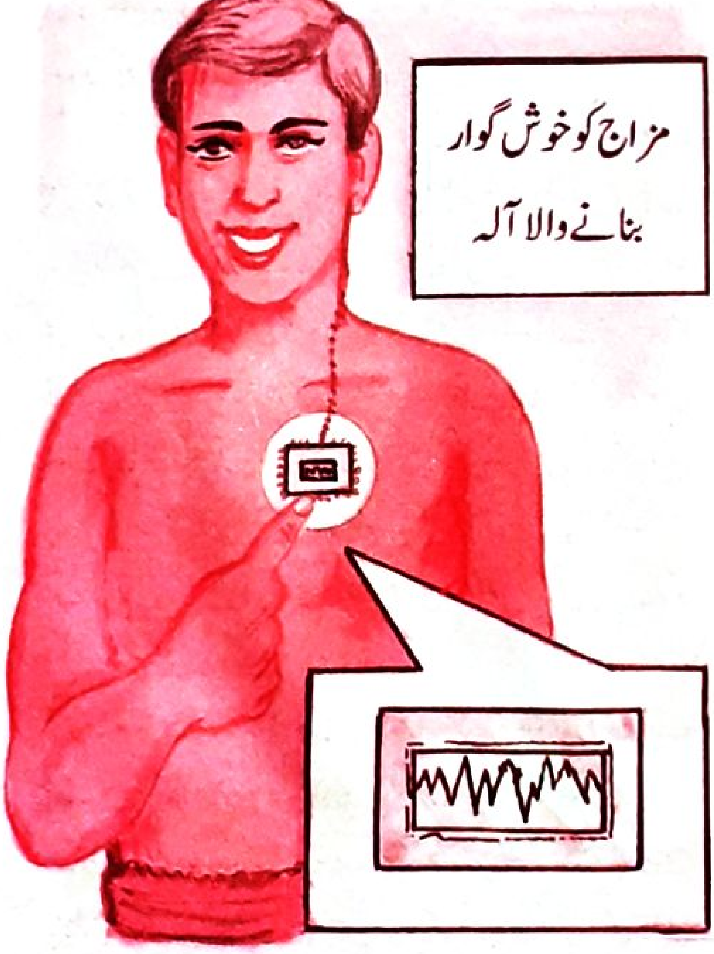

چہ سائنس دانوں نے سوچا کہ اسے مرگی کے مریضوں کے بجائے ڈپریشن کے ایسے مریضوں کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے استعمال کیا جائے جنہیں دواؤں اور دوسرے علاجوں سے فائدہ نہیں ہوا۔ انہوں نے اس صدی کے بالکل شروع میں ڈپریشن کے مریضوں پر امریکا اور دوسرے ملکوں میں تجربے کئے جو خاصے کامیاب رہے۔ لہٰذا اب تین چار سال بعد یعنی 2005ء میں اس سے باقاعدہ علاج شروع ہوگیا ہے"۔

شیخ بشیر کے گھر دعوت کے موقع پر مرزا نے پھر یہ کہانی سنائی اور فوراً خرچ کا ذکر لے بیٹھے۔

"بھئی اپنا تو دیوالہ نکل گیا اس آپریشن سے، یار اتنا مہنگا...... اتنا مہنگا حد ہوگئی"۔

شیخ صاحب کی بیگم بیچ میں بول پڑی۔

"ارے بھائی صاحب! کیوں ایسی بات منہ سے نکالتے ہیں۔ اللہ نہ کرے آپ کا دیوالہ نکلے، یہ تو جان کا"

مرزا نے بات کاٹی "بس بس بس...... جان کا صدقہ، جان کی خیرات، ہاتھ کا میل، بھابھی یہ سنتے سنتے تو کان پک گئے۔ یعنی یہاں جیب سے دس ہزار پونڈ نکل گئے اور آپ اسے صدقہ خیرات اور ہاتھ کا میل کہہ رہی ہیں"۔

شیخ صاحب نے بیوی کی حمایت کی "ٹھہرو ٹھہرو مرزا جی...... تم تو بہت ہی تیز جا رہے ہو۔ سلیم کے ہاں پہلی دعوت ہوئی تو تم نے رقم پانچ ہزار بتائی تھی۔ دس دن میں رقم دگنی ہو گئی۔ مرزا یہ لندن کے ہسپتال کا خرچ نہ ہوا تمہارے کاروبار کا منافع ہوگیا کہ دن دگنا رات چوگنا بڑھ رہا ہے۔ یارو! یہ دعوتوں کا سلسلہ ختم کرو ورنہ مرزا جلد ہی یہ اعلان کر دیں گے کہ اپنی ساری جمع پونجی لندن کے ہسپتال کی نذر کر آئے ہیں"۔

دونوں نے قہقہہ لگایا تو مرزا بھی اپنی شرمندگی چھپانے کو اس میں شریک ہوگئے۔

وقت گزرتا رہا۔ مرزا کے سینے میں لگا ہوا آلہ اپنی ٹھیک رفتار سے چلتا رہا اور مرزا پیسا بنانے اور تجوری بھرنے میں مصروف رہے۔ اس آلہ سے وہ بہت ہشاش بشاش نہ بھی رہتے ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ ڈپریشن ان کے پاس نہ پھٹکتی تھی۔ اسی طرح ڈیڑھ دو سال گزر گئے اور جمیلہ نے محسوس کیا کہ مرزا صاحب کے موڈ میں پھر تھوڑا تھوڑا فرق آنے لگا ہے۔ بہر حال کوئی خاص پریشانی کی بات نہ تھی۔

ایک دن مرزا دفتر سے لوٹے تو بیوی کو یہ خوش خبری سنائی کہ دفتر میں شہریار کا فون آیا تھا، وہ لندن سے آرہے ہیں۔ جمیلہ تو خوشی سے اچھل پڑیں اور کہنے لگیں۔

"سچ بتائیے...... کب آرہے ہیں...... کون کون آرہا ہے؟ بھابھی بھی آئیں گی؟"

مرزا نے بریف کیس ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "دونوں میاں بیوی آرہے ہیں۔ پرسوں صبح پہنچیں گے اور تین ہفتے رہیں گے"۔

جمیلہ بولیں۔ "ارے پرسوں شام؟ لیجئے تو اب وقت ہی کتنا رہ گیا ہے تیاری کے لیے"۔

مرزا موڈ میں تھے۔ شہریار نہ صرف ان کی بیوی کے بھائی تھے بلکہ ان کے بچپن کے دوست بھی تھے۔ ان کے آنے

سے وہ بہت خوش تھے۔ ہنس کر بولے۔ "ہاں بھئی تیاری تو زبردست کرنا ہوگی۔ سرخ قالین بچھواؤ، چراغاں کا انتظام کرو، گھر سجاؤ، کھانے پکاؤ"۔

جمیلہ نے بات کاٹی۔ "مفت میں؟"

مرزا بولے۔ "مفت میں یا پیسوں سے یہ تمہارا دردِ سر ہے۔ ہم تو سیر کرادیں گے انہیں"۔

جمیلہ نے پھر وار کیا۔ "اس دھکا اسٹارٹ کھٹارے میں، اللہ کا واسطہ مجھے بھائی بھابھی سے شرمندہ نہ کرائیے گا"۔

مرزا اپنی گاڑی کی شان میں یہ گستاخی برداشت نہ کر سکے۔ بلبلا کر بولے "اچھا موقع ہے، شہریار سے فرمائش کردو نئی گاڑی لیتے آئیں" یہ کہہ کر مرزا نے بریف کیس اٹھایا اور بیڈروم کی طرف چل دیئے۔

* * *

شہریار اور روبینہ کے آنے سے خوب رونق ہوگئی۔ مرزا اب دفتر میں کم بیٹھتے اور گھر پر زیادہ رہتے۔ موڈ بھی بہت اچھا رہتا تھا۔ جمیلہ اس بات سے خوش تھی کہ ان کے بھائی بھابھی کے آنے سے مرزا بھی اس قدر خوش اور مگن ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ مرزا کے موڈ سے فائدہ اٹھا کر ان سے کچھ فاضل رقم وصول کرلیں تاکہ مہمانوں کی خاطر اچھی طرح ہو سکے۔ موقع پا کر اس نے بات نکالی۔

"میں سوچتی ہوں بھائی جان اور بھابھی کو آئے کئی دن ہوگئے، آج انہیں کہیں سیر کرالائیں"۔

مرزا نے جو جواب دیا اسے سن کر جمیلہ کو اپنے کانوں پر شک ہونے لگا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے دونوں کانوں میں انگلی ڈالی اور اسے زور زور سے ہلایا، گویا اپنے کان صاف کر رہی ہو۔ پھر آنکھیں پھاڑ کر مرزا کو دیکھا اور کہنے لگیں۔

"مرزا صاحب! مہربانی کر کے اپنا جملہ دہرادیجئے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔ منہ ذرا میرے کان کے قریب لے آیئے"۔

مرزا مسکرائے اور بولے۔ "تمہارے کان بالکل ٹھیک سن رہے ہیں۔ ان پر یقین کرلو اور غور سے سنو، میں نے آج

دوپہر سے دو ہفتے کے لیے ایک نئی گاڑی کرائے پر لی ہے۔ تھوڑی دیر میں آتی ہی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ سیر سپاٹے کے بعد آج شام کا کھانا کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں ہوگا۔ کل ہم دفتر سے پوری چھٹی کریں گے۔ کیوں کہ روبینہ لبرٹی، پینوراما اور انار کلی جانا چاہتی ہیں۔ شاپنگ کے لیے آپ ساتھ چلیں گی اور ہم اپنی جیب خاص سے آپ کی شاپنگ کے لیے یہ چیک پیش کرتے ہیں۔ اسے آج یا کل کیش کرالیں اور ہاں کل دوپہر کا کھانا بھی باہر ہوگا"۔

جمیلہ پر تو جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔ انہوں نے اپنی کلائی پر چٹکی لی اور بولیں "جاگ رہی ہوں۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے...... اللہ تیری شان...... مرزا صاحب آپ اپنے قول سے پھر تو نہیں جائیں گے؟"

مرزا نے سینہ تان کر کہا۔ "جمیلہ بیگم! مرد کا قول ایک ہوتا ہے۔ چیک قبضہ میں لے لیا پھر بھی شک کر رہی ہو؟ میرے چہرے کو کیوں تکے جارہی ہو؟"

جمیلہ نے بڑی سنجیدہ شکل بنا کر کہا۔ "میں آپ کا چہرہ

نہیں تک رہی اس زمانے کے حاتم کا چہرہ دیکھ رہی ہوں"۔

مرزا صاحب نے شہریار اور روبینہ کی دل کھول کر خاطر مدارات کی۔ ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے شہریار نے جمیلہ سے کہا۔ "کیوں جی تم نے ہمارے دوست کو خواہ مخواہ بدنام کیا ہوا ہے کہ وہ کنجوس ہے' کنجوسی ایسی ہوتی ہے؟"

جمیلہ نے مسکرا کر مرزا کو دیکھا اور بولیں۔ "بھائی جان! میں تو خود حیران پریشان ہوں کہ یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا۔ بس آپ یہ دعا کیجئے کہ سخاوت کا دریا چڑھا ہی رہے۔ کہیں اترنے نہ لگے"۔

"بھئی میرا خیال ہے احمد علی بھائی کبھی بھی کنجوس نہیں تھے۔ لوگوں نے ایسے ہی بدنام کیا ہوا ہے"۔ روبینہ نے کہا۔

مرزا خوش ہو گئے اور جمیلہ سے کہنے لگے۔

"جمیلہ! تم نے اپنے اور بچوں کے لیے ہی شاپنگ کی یا اپنی بھابھی کے لیے بھی کوئی تحفہ خریدا۔ دیکھو روبینہ کو اچھا تحفہ دینا۔ ٹالنا نہیں' اگر پیسے ختم ہو گئے ہیں تو اور لے لو"۔

جمیلہ نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہنے لگیں۔

"سخاوت کا دریا تو زیادہ ہی چڑھ گیا۔ چلیں تھوڑے سے پیسے اور دے دیں"۔

مرزا صاحب کی کنجوسی ہی ختم نہیں ہوئی تھی' ان کی پوری مزاجی حالت بدل گئی تھی۔ ہر وقت موڈ بہت اچھا رہتا۔ ہشاش بشاش نظر آتے۔ کاروبار کے بارے میں چند بہت فائدہ مند باتیں ان کے ذہن میں آئیں۔ گھر کے معاملات میں بھی دل چسپی لینے لگے اور فلاحی کاموں میں بھی پیسا خرچ کرنا شروع کر دیا۔

وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ پتا ہی نہ چل سکا۔ شہریار اور روبینہ کی واپسی میں چار پانچ دن رہ گئے۔ جمیلہ نے اکیلے میں مرزا سے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ بھائی جان کے لیے بھی کوئی تحفہ لے آؤں"۔

مرزا نے بڑے شاہانہ انداز میں کہا۔ "ارے بھئی' تو میں نے منع کیا ہے کیا؟ ہاں شہریار کے لیے ضرور کوئی اچھی سی چیز لے آؤ اور جلدی لے آؤ کیوں کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ تم نے تو اتنی کنجوسی شروع کر دی ہے کہ بس"۔

جمیلہ نے حیرت سے شوہر کا منہ تکتے ہوئے کہا۔ "اللہ تیری قدرت' اچھا تو ہم کنجوس ہو گئے...... واہ بھئی واہ...... سخاوت کا دریا تو چڑھتا ہی جا رہا ہے"۔

مرزا صاحب تھوڑا سا جھنجھلا گئے۔

"یہ تم نے میری چڑ بنا لی ہے۔ سخاوت کا دریا...... سخاوت کا دریا' یہ کیا رٹ لگائی ہے۔ خیر چھوڑو' یہ بتاؤ کہ وہ چیک بھیج دیا تھا سیلاب فنڈ کے لیے؟"

"جی ہاں جناب! آپ کے حکم کی تعمیل کر دی اور وہ آپ نے مریضوں کے لیے جو......"

مرزا نے بیوی کی بات کاٹی۔ "ہاں ہاں وہ چیک میں نے دفتر سے بھجوا دیا تھا کیوں کہ ان کا پتا دفتر میں ہی رکھا تھا۔ تمہیں اندازہ ہو گا کہ میں نیک کاموں میں دیر نہیں کرتا کبھی"۔

"کبھی!" یہ کہ کر جمیلہ نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی اور پھر بولی "ہاں بھئی بتائیں کہ وہ جوڑا آپ نے دیکھ لیا جو میں نے بھابھی کے لیے خریدا ہے؟"

مرزا نے چہک کر کہا۔ "ہاں روبینہ نے دکھایا تھا۔ واہ واہ کیا بات ہے اس جوڑے کی لیکن تم نے اپنے لیے نہیں خریدا۔ یقین جانو خوب سجتا تم پر"۔

جمیلہ نے دیکھا کہ لوہا گرم ہے۔ بس ہتھوڑا چلانے کی دیر ہے' بولیں "ارے چھوڑیئے مرزا صاحب' ہماری قسمت ایسی کہاں۔ بس گزر گئی اچھی بری"۔

مرزا صاحب کو جوش آ گیا۔

"ارے کیوں اللہ کی ناشکری کرتی ہو۔ جو کچھ ہے تم لوگوں کے لیے ہی ہے۔ چلو ابھی چلو بازار"۔

جمیلہ نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے کہا۔ "ذرا ٹھہریئے' میں ایک بار اپنے چٹکی کاٹ لوں۔ پھر آگے بات کروں گی"۔

مرزا کچھ پریشان ہو کر بولے۔ "ہائیں خیریت تو ہے؟ یہ چٹکی کیوں؟"

جمیلہ مسکرا کر بولیں۔ "سوچا ایک بار پھر یقین کر لوں کہ جاگ رہی ہوں یا......" مرزا نے بات کاٹی۔ "بس اب پھر وہ دریا وریا کی رٹ نہ لگانا...... سخاوت وخاوت کی۔ بہر حال میری پیش کش موجود ہے، جب چاہو......"

اس بار جمیلہ نے بات کاٹی اور زور سے ہنستے ہوئے کہا۔ "مطلب یہ ہوا کہ جب چاہو سخاوت کے بہتے دریا میں ہاتھ دھو لو...... بلکہ غوطہ لگاؤ۔ ٹھیک ہے پیش کش منظور"۔

لیجئے چار دن بھی پر لگا کر گزر گئے اور بھائی بھابی کی واپسی میں ایک دن رہ گیا۔ مرزا دفتر میں تھے اور جمیلہ برآمدے میں بیٹھی شہریار اور روبینہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے بڑی اداسی سے کہا۔ "وقت کا ذرا پتا نہ چلا۔ اتنی تیزی سے گزرا۔ کل کیسے دل مانے گا کہ آپ کو رخصت کروں"۔

شہریار نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بھئی جتنے دن بھی رہتے نہ تمہارا دل بھرتا اور نہ ہمارا، چلو اب کچھ دن بعد تم لوگ چکر لگانا لندن کا، احمد علی نے پکا وعدہ کیا ہے...... اور ہاں یہ ریموٹ کنٹرول سنبھال لو۔ اس کے بارے میں اتنا بتانا کافی ہے کہ جو آلہ احمد علی کے سینہ میں 2005ء میں لگایا گیا تھا یہ اسی آلے کا ریموٹ کنٹرول ہے جو کچھ دن بلکہ یوں سمجھو کہ 2006ء میں بنایا گیا۔ سینہ میں لگا آلہ عام طور سے ہر تیس منٹ بعد دماغ کو برقی لہر بھیجتا ہے۔ لیکن اس ریموٹ کنٹرول کے ذریعے یہ تیس منٹ کا وقفہ کم یا زیادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام انفرا ریڈ شعاعوں سے لیا جاتا ہے جو اس کمپیوٹر یا ریموٹ کنٹرول سے نکل کر سینے میں لگے آلے میں جاتی ہیں لیکن مریض کو محسوس نہیں ہوتا۔ اگر وقفہ تیس منٹ سے کم کر دیا جائے تو اس کا موڈ بہت اچھا ہو جاتا ہے اور اگر وقفہ بڑھا دیا جائے تو موڈ بہت اچھا نہیں رہتا ہے۔ بس معمول کے مطابق رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ موڈ بہت اچھا ہو تو انسان پیسا خرچ کرنے اور سیر تفریح وغیرہ ہر بات پر تیار ہو جاتا ہے۔ یہ وہم بھی ختم ہو جاتا ہے کہ اگر پیسا خرچ ہو گیا تو آیندہ زندگی کیسے گزرے گی۔ ہم نے سوچا کہ تمہارے پاس آ رہے ہیں تو یہ تحفہ تمہارے لیے لیتے چلیں۔ شاید اس سے احمد علی کی کنجوسی کم ہو

اور تم سب لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مزا لے لو۔ اور شاید احمد علی کے پیسے سے ضرورت مند عزیزوں اور اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچ جائے"۔

جمیلہ نے ریموٹ کنٹرول کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"واہ واہ! بھائی جان یہ تجربہ تو بے حد کامیاب رہا۔ لیکن اسے استعمال کرنے کا طریقہ تو سمجھا دیجئے۔ آپ نے ایسا راز میں رکھا اسے"۔

شہریار بولے۔ "ہاں تجربہ بہت کامیاب رہا اور اس کا طریقہ بھی سمجھائے دیتا ہوں لیکن اس سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرنا۔ کہیں میرے دوست کی ساری دولت قبضہ میں کر لو۔ اگر گڑبڑ کی تو یہ راز شہریار کو بتا دوں گا"۔

تینوں مل کر ہنسے اور جمیلہ بولیں۔ "راز تو کچھ دن بعد میں خود ہی انہیں بتا دوں گی۔ ذرا خرچ کرنے کی تھوڑی عادت پڑ جائے۔ میرا خیال ہے سخاوت کا چڑھا ہوا دریا پھر اترے گا نہیں"۔

بگھی کا راز

رضوانہ سید علی

سعید اکرم حسن حارث اور منان نے گرمیوں کی چھٹیوں میں کسی پر فضا مقام پر جانے کا پروگرام بنایا۔ ویسے تو تقریباً سبھی لڑکے کئی مرتبہ مختلف صحت افزا مقامات پر جا چکے تھے لیکن تنہا جانے اور کیمپنگ کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

وہ اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچے تو گہرے سبز گھنے جنگلات اور گنگناتے چشمے دیکھ کر ان کے دل خوشی سے بھر گئے۔ وہاں حارث کے ابو ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ لڑکوں کو اس جگہ لے گئے جہاں کیمپنگ کا سامان ملتا ہے۔

لڑکوں کو خیموں کے سامان کے ساتھ ایک گائیڈ حسن خان بھی دیا گیا اور ایک گائیڈ بک بھی فراہم کی گئی جس میں تمام نقشے اور ان مقامات کی تفصیل دی گئی تھی جہاں کیمپنگ کی جا سکتی تھی۔ لڑکے گائیڈ حسن خان کا نام سن کر بہت چکرائے۔ کیوں کہ ایک حسن تو پہلے ہی ان میں موجود تھا اور سب لڑکے بے چوں چرا اسے اپنا لیڈر مانتے تھے۔ لڑکوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے حسن کو کمانڈر اور گائیڈ کو حسن خان کہا جائے گا۔

اب لڑکے کیمپنگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ ایک بے حد خوب صورت چھوٹی سی وادی تھی جو چاروں طرف سے گھنے جنگلات میں گھری تھی۔ لڑکوں نے اپنا کیمپ جھیل کے کنارے لگایا تھا۔ جھیل کے یخ بستہ شفاف پانی میں ٹراؤٹ مچھلیاں اچھلتی صاف نظر آتی تھیں۔ ایسا سہانا سماں تھا کہ لڑکوں کو لگتا تھا جیسے زمین کا یہ ٹکڑا شاید آسمان سے اترا ہے۔ حسن خان کھانا بنانے میں بھی بہت ماہر نکلا تھا ایسا لذیذ کھانا بناتا تھا کہ بس مزہ ہی آ جاتا تھا۔ وہ کئی مرتبہ تو ٹراؤٹ مچھلی تل کر بھی کھلا چکا تھا۔ بس مزے ہی مزے تھے۔ حارث کے ابو روز موبائل فون پر رابطہ کر کے خیر خیریت بھی پوچھ لیتے تھے اور یہ بھی کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟

ایک روز پانچوں لڑکے ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر سیر کو نکلے۔ موسم بے حد خوش گوار تھا۔ لڑکے چمکیلے پتھروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے تھے۔ حسن (کمانڈر) سب سے آگے نکل گیا تھا۔ وہ ایک بڑے پتھر پر کھڑا ہو کر باقی لڑکوں کا انتظار کرنے لگا۔ پھر وقت گزارنے کے لیے وہ یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے ذرا سا جھک کر پہاڑ کے دوسری طرف جھانکا۔ اس طرف ایک دوسری بل کھاتی پگڈنڈی دور کہیں کسی وادی میں اتر رہی تھی۔ پگڈنڈی کے بالکل درمیان میں کوئی چیز نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں دوسرے لڑکے بھی آ گئے۔ کمانڈر نے منان کے ہاتھ سے دور بین لے کر آنکھوں سے لگائی اور پھر چیخ پڑا "ارے یہ کیا؟"

"کیا؟ کیا؟" سب ایک ساتھ دور بین سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگے "ارے بھئی! باری باری دیکھو، کیا لڑھکنے کا ارادہ ہے؟" کمانڈر نے سعید کو دور بین دیتے ہوئے کہا۔ چاروں لڑکوں نے باری باری دور بین سے دیکھا۔ یہ ایک بگھی تھی جس

میں بیٹھی سواریاں بھی نظر آ رہی تھیں مگر کوچوان کی جگہ خالی تھی۔

"یہ بگھی یہاں کہاں سے آ گئی؟" حارث پریشان ہو کر بولا۔

"یہ سوچنا بعد کی بات ہے، ابھی تو بگھی میں بیٹھے افراد کو ہماری ضرورت ہے۔ گھوڑے سرپٹ بھاگ رہے ہیں اور کوچوان غائب ہے" یہ کہتے کہتے کمانڈر کسی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا نیچے اترنے لگا۔ اس کے باقی ساتھی بھی گرتے پڑتے اس کے پیچھے لپکے۔ کافی دیر بعد جب وہ اس کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو وہ ایک چٹان پر کھڑا بغور نیچے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ رک کیوں گئے؟" سب نے ایک ساتھ پوچھا۔

"وہ دیکھو" اس نے انگلی سے نیچے اشارہ کیا۔ "گھوڑے بظاہر سرپٹ بھاگ رہے ہیں مگر ابھی تک وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکے۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو بھئی، وہی ایک جانب اخروٹ کا درخت ہے اور دوسری جانب بڑی سی کاہی رنگ کی چٹان۔ اگر یہ گھوڑے بھاگ رہے ہوتے تو اب تک کہیں سے کہیں نکل چکے ہوتے"۔

"بھئی اپنی سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا"۔ حارث نے سر کھجایا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بگھی اور گھوڑے اصلی نہیں۔ اب دیوانہ وار بھاگنے کی ضرورت نہیں، آرام سے چلتے ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے کمانڈر صاحب آرام آرام سے چلنے لگے۔ باقی لڑکے بھی پیچھے ہو لیے۔ قریب پہنچنے پر کمانڈر کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ گھوڑے پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے تھے۔ بگھی کے اندر سچ مچ کے مسافروں کی جگہ پتلیاں بیٹھی تھیں۔ بگھی بالکل نئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی کسی نے تیار کر کے یہاں رکھ دی ہے۔ لڑکے حیران تھے کہ آخر یہ کیا معمہ ہے؟ اچانک اکرم کی نظر دو کنڈوں پر پڑی جو گھوڑوں کے ساز کے دونوں طرف لگے تھے۔ "یہ کنڈے بتا رہے ہیں کہ اس بگھی کو کسی گاڑی کے ساتھ جوڑ کر کہیں لے جایا جا رہا تھا"۔ اس نے سر ہلایا۔

"پھر وہ گاڑی کہاں ہے اور اس چمک دار بگھی کو یہاں چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئی؟" منان نے سوال کیا۔

اس سے پہلے کہ کوئی اور بولتا، کسی ٹرک کی گھوں گھوں سنائی دینے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑا سا ٹرک کچی پگڈنڈی پر اچھلتا کودتا دکھائی دینے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ ٹرک بگھی کے قریب آ کر رک گیا۔ کمانڈر نے آگے بڑھ کر ڈرائیور سے اپنا اور اپنے دوستوں کا تعارف کروایا اور بتایا کہ کس طرح وہ اوپر سے مسافروں کی مدد کے لیے اترے تھے۔ ڈرائیور ہنسنے لگا۔ اس کا نام خستہ گل تھا۔ خستہ گل نے بتایا کہ یوں تو اس پوری وادی میں آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں مگر ابھی حال ہی میں شیر بابا کی وادی میں ایک پورے شہر کے آثار برآمد ہوئے ہیں۔ یہ لاکھوں برس پرانا شہر شاید کسی زلزلے سے تباہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس شہر کے اوپر ایک اور شہر آباد ہو گیا تھا۔ آج سے سو سال پہلے وہ بھی زلزلے کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بستی شیر بابا کے نام سے ایک اور قصبہ آج کل بھی آباد ہے جو ان کھنڈرات سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہاں پر سردار گل زیب خاں رہتے ہیں جو بہت امیر آدمی ہیں۔ انہوں نے حکومت کو بے شمار رقم دی ہے تاکہ پرانے شہر سے نکلی ہوئی چیزوں کو ایک عجائب گھر کی صورت میں محفوظ کر دیا جائے۔ یہ بگھی بھی اسی شہر سے برآمد ہوئی ہے۔ گل زیب خاں صاحب نے اسے قریشی شہر میں بھیجا تھا تاکہ اس کی حالت درست کر کے اسے عجائب گھر میں رکھا جائے۔ یہ گھوڑے اور مسافروں کی پتلیاں وہاں کے ایک فن کار نے تیار کی ہیں تاکہ......"

"مگر آپ بگھی کو جنگل میں چھوڑ کر کہاں گئے تھے؟" اکرم نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں وہی بتانے جا رہا تھا۔ یہاں میرے ٹرک میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ خطرہ تھا کہ آگے جا کر ٹرک رک نہ جائے۔ اس لیے میں بگھی کو یہاں کھڑا کر کے ٹرک کی خرابی دور کروانے گیا تھا"۔

لڑکوں کو یہ کہانی بہت دل چسپ لگی۔ خستہ گل نے سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہیں بستی شیر بابا آنے کی دعوت دی اور لڑکوں نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور عجائب گھر دیکھنے آئیں گے۔

شام کو جب وہ کیمپ فائر کے گرد بیٹھے سوپ پی رہے

تھے تو حارث کے ابو کا فون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ تم لوگوں کے کیمپ سے کچھ دور بستی شہباز خان ہے۔ اس کے سردار دل نواز خاں نے لڑکوں کو دعوت دی ہے کہ کل دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھائیں۔ حسن خاں کو بستی کا راستہ معلوم ہے۔

اگلے روز لڑکے بستی شہباز خاں پہنچ گئے۔ یہ بہت خوب صورت اور پرسکون گاؤں تھا۔ سردار دل نواز خاں اپنے ملازموں کے ساتھ بستی کے باہر ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ سفید بالوں اور بڑی بڑی مونچھوں والے سردار صاحب کی آواز اتنی ملائم تھی کہ ان کی شخصیت سے جو خوف کا تاثر پیدا ہوا تھا وہ ایک دم ختم ہو گیا اور لڑکے فوراً ان سے گھل مل گئے۔ سردار صاحب کا گھر ایک پرانی حویلی نما تھا۔ دیواروں پر شیر، ریچھ، چیتوں کی کھالیں اور بارہ سنگھوں کے سر آویزاں تھے اور بارعب سرداروں کی تصویریں بھی لگی تھیں۔ سردار صاحب نے بتایا کہ یہ سب ان کے آباؤاجداد کی تصویریں ہیں۔ ایک تصویر دیکھ کر کمانڈر چونک اٹھا۔ "انکل یہ کون ہیں؟"

"یہ......" سردار صاحب کھو سے گئے۔ پھر آہستہ آہستہ بولے "یہ میرے دادا سردار جان باز خاں کی تصویر ہے"۔

پھر کھانے کے بعد لڑکوں نے حویلی کی سیر کی۔ یہ حویلی ایک پہاڑ کو کاٹ کر تعمیر کی گئی تھی۔ اس کا مہمان خانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی چھت کے درمیان میں ایک ہی شہتیر لگا تھا جو 150 فٹ لمبا تھا۔ فرش پر قالین بچھانے سے پہلے ایسی گھاس بچھائی گئی تھی جو فرش کو نرم گرم اور نمی سے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ لڑکے یہ قدیم حویلی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

سردار صاحب نے بتایا

"ہماری بستی میں بہت غربت تھی۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کو کمانے کے لیے باہر جانا پڑتا تھا۔ میرے پردادا جن کی تصویر تم نے دیکھی ہے یہ روزگار کی تلاش میں ایک دوسری بستی چلے گئے تھے۔ وہاں جا کر ان کے کاروبار نے بہت ترقی کی۔ وہ علاقے کے بااثر آدمی بن گئے۔ ان کے پاس بے شمار دولت ہو گئی۔ ان کی اپنی ٹرانسپورٹ تھی"۔

"کون سی گاڑی تھی آپ کے دادا کے پاس؟" بچوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بیٹا، سو برس پہلے اپنی ٹرانسپورٹ کا مطلب تھا کہ آدمی کی اپنی گھوڑا گاڑی ہے۔ ان کے پاس شان دار سی بگھی تھی جسے کئی گھوڑے کھینچتے تھے۔ باوردی کوچوان باہر بیٹھتا تھا۔ پائیدانوں پر دو دو پہرے دار شان دار وردی پہنے کھڑے ہوتے تھے"۔

"پھر کیا ہوا؟" سب نے بے چینی سے پوچھا۔

"جب میرے دادا نے ڈھیر ساری دولت حاصل کر لی تو ایک روز ان کا ایک پیغام دادی جان کو موصول ہوا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ: وہ چاہ رہے تھے کہ اپنے خاندان کو اپنے پاس بلا لیں مگر افسوس تقدیر نے مہلت نہ دی۔ میں نہ تم لوگوں کو اپنے پاس بلا سکا نہ خود آ سکا۔ ساری بات میرا خاص ملازم تم لوگوں کو بتا دے گا۔ میں نے اپنی ساری دولت اپنی بگھی میں ایک خفیہ جگہ چھپا دی ہے۔ یہ دولت بھی وہی تم لوگوں کے حوالے کر دے گا۔ یہ پیغام ملتے ہی تم فوراً میرے آدمی کے ساتھ چلی آنا اور ہاں میرے بچوں کو بہت زیادہ تعلیم دلوانا۔

یہ خط دادا جان نے بالکل آخری وقت میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

جس رات ان کا آدمی یہ پیغام لے کر آیا اسی رات شدید زلزلہ آیا اور وہ بستی تباہ ہو گئی"۔

"اوہ" سب کے منہ سے نکلا۔ "مگر انکل، آپ کے دادا جان کی بگھی موجود ہے"۔ کمانڈر مسکرایا۔

"کہاں؟" سردار صاحب حیران ہوئے۔

"پہلے انکل یہ بتائیے کہ آپ نے ابھی جو دادا جان کی تصویر دکھائی تھی وہ کب کی ہے؟"

"وہ تصویر بھی ان کا آدمی پیغام کے ساتھ لایا تھا"۔

"اور آپ کے دادا جان بستی شیر بابا میں رہتے تھے"۔

"ارے تمہیں کیسے معلوم؟" سردار صاحب مزید حیران ہوئے "آج کل اس نام کی بستی موجود تو ہے مگر پرانی بستی تو زلزلے کی بھینٹ چڑھ گئی تھی"۔

حسن ابھی سردار صاحب کی بات کا جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ حارث بول اٹھا۔

"کمانڈر تمہارا خیال ہے کہ وہ بگھی جو ہم نے راستے میں دیکھی تھی سردار انکل کے دادا جان کی ہے؟ تم یہ بات یقین سے تو نہیں کہہ سکتے"۔

"میں یہ بات پورے یقین سے کہہ رہا ہوں۔ اور اس کا ثبوت ابھی دے سکتا ہوں"۔

"ارے لڑکو! تم کیا پہیلیاں بوجھوا رہے ہو، کچھ مجھے بھی تو بتاؤ" سردار دل نواز صاحب پریشان ہو کر بولے۔

"انکل! میں ابھی آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ آیئے ذرا دادا جان کی تصویر کے پاس پھر چلتے ہیں" سب پریشان سے تصویر کے پاس گئے اور اب جو تصویر کو غور سے دیکھا تو دادا جان کی تصویر کے پس منظر میں ایک بگھی نظر آئی۔ سب لڑکے ایک ساتھ چلا اٹھے "ارے! یہ تو وہی بگھی معلوم ہوتی ہے۔ وہی سیاہ رنگ، سنہرے حاشیے، ہر چیز کی وہی بناوٹ ہے"۔

"جی! اب سمجھے آپ۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ پہلے یہ بگھیاں وغیرہ ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی تھیں۔ کسی کسی بستی میں کوئی ایک آدھ بندہ ہی ان کا مالک ہوتا تھا۔ اس لیے مجھے تو پورا یقین ہے کہ بستی شیر بابا سے برآمد ہونے والی بگھی ہمارے سردار انکل کے دادا جان کی ہی ہے" اور پھر کمانڈر نے پورا قصہ سردار صاحب کو سنا دیا۔ ان کی تو آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ کہنے لگے۔ "کچھ کچھ یقین مجھے بھی ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا اور دادا جان کا گم شدہ خزانہ مل گیا تو میں اس بستی میں ایک شان دار اسکول بنواؤں گا"۔

"آپ فکر نہ کریں انکل۔ ویسے بھی خستہ گل ہمیں وہاں کی دعوت دے کر گیا ہے۔ ہم لوگ کل ہی وہاں پہنچتے ہیں"۔

رات کو کیمپ فائر کے چاروں طرف بیٹھ کر وہ دیر تک گرما گرم بحث کرتے رہے۔ سڑک والی بگھی اور سردار جان باز خاں کی بگھی کے ہر پہلو پر غور کیا گیا۔ خستہ گل اور سردار دل نواز کی باتوں کے تجزیے کیے گئے۔ اندازے لگائے گئے کہ بگھی میں خزانہ کہاں چھپایا جا سکتا ہے اور خزانے کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے؟ آخر اکرم نے جمائی لیتے ہوئے یاد دلایا کہ آگ کی آخری لکڑی بھی چیخ کر خاموش ہو چکی ہے۔ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے اور صبح ہمیں جلدی اٹھنا ہے۔ لہٰذا پر اسرار بگھی پر اب بحث بند ہونی چاہیے۔ ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ کر وہ سب اپنے اپنے سفری بستروں میں گھس کر بے خبر سو گئے۔

صبح صبح حسن خاں نے سب کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر اٹھایا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا بھانجا چھت سے گر کر بری طرح زخمی ہو گیا ہے لہٰذا وہ فوراً گاؤں جا رہا ہے۔ اور پھر وہ عجلت میں وہاں سے چلا گیا۔ لڑکے بے چارے صبح صبح یہ بری خبر سن کر پریشان ہو گئے۔ خیر آج انہوں نے ناشتا وغیرہ خود تیار کیا۔ ہر چیز سمیٹی اور پھر حارث نے فون کر کے اپنے ابو کو بتا دیا کہ آج وہ بستی شیر بابا کے قریب کھدائی سے نکلنے والا پرانا شہر دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ سردار گل زیب خان ان کے دوست ہیں۔ وہ انہیں فون کر دیں گے۔

بستی شیر بابا ان کے کیمپ سے زیادہ دور نہ تھی۔ وہ جلد ہی وہاں پہنچ گئے اور وہاں پہنچ کر ان کا دل خوش ہو گیا۔ کھدائی مکمل ہو چکی تھی۔ ایک صاف ستھرے چھوٹے سے شہر کے آثار سامنے آ چکے تھے۔ کچھ عمارتیں تو کافی اچھی حالت میں تھیں۔ انہی میں سے ایک کو عجائب گھر بنا دیا گیا تھا۔ ایک پن چکی کے بھی آثار ملے تھے۔ اس کو بھی کافی درست کر دیا گیا تھا۔ خستہ گل سردار گل زیب کا پرانا ملازم تھا۔ اس نے لڑکوں کو سردار صاحب سے ملوایا تو وہ کہنے لگے کہ ہاں ابھی مجھے وحید صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ "بھئی لڑکو! تم تو بہت پھرتیلے نکلے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ شہر کے لڑکے اتنی جلدی پہنچ جائیں گے۔ اب کیا خیال ہے پہلے کھانا ہو جائے پھر سیر؟"

"نہیں انکل، ہم پہلے سیر کریں گے۔ ابھی اتنی جلدی کھانے کی ضرورت نہیں"۔

"بھئی جیسے تمہاری مرضی"۔

سردار گل زیب اور خستہ گل انہیں پرانے شہر کی طرف لے چلے۔ راستے میں لڑکوں نے انہیں بگھی کے بارے میں بتایا۔ وہ سن کر بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے کہ یہ بگھی خاصی ٹوٹی پھوٹی حالت میں برآمد ہوئی تھی۔ میں نے یہ خیال رکھتے ہوئے کہ اس کی پرانی صورت برقرار رہے، اسے ٹھیک

کروایا ہے۔ نقلی گھوڑوں کا آئیڈیا بھی میرا ہی تھا۔ میں نے سوچا کہ نئی نسل کے لیے یہ ایک شان دار تحفہ ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بگھی سردار جان باز خان ہی کی ہو اور اس میں کوئی خفیہ خانے موجود ہوں۔ پرانے شہر میں کئی بڑھئی کام کر رہے ہیں۔ ہم اسے احتیاط سے کھلوائیں گے...... "ابھی سردار صاحب کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ کچھ ملازم پریشان اور بدحواس بھاگتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ کچھ نقاب پوش آئے تھے اور وہ وہاں موجود آدمیوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بگھی لے بھاگے ہیں۔

"ہائیں! یہ اتنی جلدی ڈاکوؤں کو بھی خبر ہو گئی؟" سردار صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"گل زیب انکل! مجھے یقین ہے کہ ڈاکو بگھی کہیں دور نہیں لے جائیں گے۔ وہ قریبی جنگل میں ہی اسے توڑنے کی کوشش کریں گے۔ آپ پولیس کو اطلاع کریں ہم خستہ گل کے ساتھ ڈاکوؤں کے پیچھے جاتے ہیں"۔ حسن یہ کہتے ہوئے تیزی سے آگے لپکا۔ سب لڑکے اور خستہ گل اس کے پیچھے بھاگے۔ جلد ہی وہ جنگل میں گھس گئے۔ چلتے چلتے ایک ایسا موڑ آیا جہاں ایک بڑے سے پتھر پر راستہ ختم ہو گیا۔ اس پتھر کے آس پاس کوئی پودا یا درخت نہیں تھا اور اس کے پہلو سے ایک تنگ سی گھاٹی نیچے اتر رہی تھی۔ لڑکوں نے احتیاط سے اس بڑے پتھر کے دائیں بائیں ہو کر دیکھا۔ نیچے ایک کھلی وادی موجود تھی اور وہاں بگھی الٹی پڑی تھی۔ اردگرد کوئی نہ تھا۔ کمانڈر نے منہ پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ سب پیچھے ہٹ گئے۔ "خستہ گل!" کمانڈر نے سرگوشی کی "تم فوراً جاؤ اور انکل گل زیب اور پولیس کو لے کر آؤ۔ ہم یہاں چھپ کر بگھی کی نگرانی کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکو کہیں قریب چھپ کر جائزہ لے رہے ہیں کہ اگر کوئی پیچھا نہ کرے تو وہ بگھی کو توڑ کر خزانہ نکال لیں"۔

خستہ گل فوراً واپس بھاگا۔ لڑکے ادھر ادھر چھپ کر بگھی کی نگرانی کرنے لگے۔ ڈھلوانی راستہ جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ کمانڈر انہی جھاڑیوں میں سے ایک میں چھپ کر نیچے وادی کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سامنے کی جھاڑیوں سے دو آدمی نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھوڑے تھے۔ کمانڈر پریشان ہو گیا۔ پولیس کے آنے تک تو یہ لوگ بگھی توڑ کر خزانہ نکال چکے ہوں گے۔ پھر انہیں بھاگنے میں کتنی دیر لگے گی، لیکن اس کے تیز دماغ میں فوراً ایک ترکیب آ گئی۔ وہ چپکے چپکے اپنے ٹھکانے سے اٹھا اور اس بڑے پتھر پر چڑھ کر اس نے مخالف سمت میں ایک پتھر لڑھکا دیا اور خود واپس اپنی جھاڑی میں آ چھپا۔ پتھر خاصا شور کرتا ہوا نیچے گرا اور ایک سخت چٹان پر ٹکرانے سے اس کی آواز دور دور تک سنائی دی۔ ڈاکو چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ مگر مزید کوئی آواز نہ آئی تو وہ پھر بگھی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابھی انہوں نے پہلا ہتھوڑا ہی مارا تھا کہ جھاڑیوں میں سے ایک اور نقاب پوش برآمد ہوا۔ "ارے کم بختو!" "تم نے ابھی تک کچھ نہیں کیا؟"

"وہ ہتھوڑوں والا تھیلا مل نہیں رہا تھا"۔

"تھیلے کے بچو! پھینکو سب کچھ

اور بھاگو۔ پولیس کی جیپ آرہی ہے"۔

"رک جاؤ! حسن خان، تم کہیں نہیں جاسکتے"۔ کمانڈر نے نعرہ لگایا اور جھاڑیاں پھلانگتا نیچے اترنے لگا۔ پولیس کی جیپ کے بارے میں سن کر اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ باقی لڑکے بھی اپنے ٹھکانوں سے نکل کر ان کی طرف لپکے اور پھر پھرتی سے انہوں نے تینوں آدمیوں کو دبوچ لیا۔ وہ تینوں کچھ بھی نہ کر سکے کیوں کہ پولیس کی جیپ واقعی آپہنچی تھی اور پولیس نے وادی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

کمانڈر نے حسن خاں کا نقاب اتار دیا۔ وہ سخت شرمندہ کھڑا تھا۔ حارث کا غصے سے برا حال تھا۔ اسے اپنے ملازم سے یہ امید نہ تھی۔

بگھی کے خفیہ خانوں سے بے حد قیمتی پتھر اور سونے کے سکے برآمد ہوئے اور حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ٹرسٹ قائم کر دیا جائے گا جس کے سربراہ سردار دل نواز خاں ہوں گے اور یہ ٹرسٹ علاقے میں اسکول اور کالج قائم کرے گا۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ لڑکوں نے کیمپ ختم کیا اور حارث کے گھر آگئے۔ حارث کے ابو نے کمانڈر سے پوچھا کہ اس کو کیسے اندازہ ہوا کہ نقاب پوش حسن خان ہے۔ کمانڈر نے بتایا کہ جونہی سردار گل زیب کے آدمیوں نے بتایا کہ ڈاکو بگھی چرا کرلے گئے ہیں، مجھے اسی وقت اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کام حسن گل کا ہے۔ کیوں کہ مجھے اس روز صبح ہی سے کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ مگر یہ پتا نہ چلتا تھا کہ وہ بات ہے کیا۔ ڈاکے کی اطلاع ملتے ہی میرے ذہن میں جھماکا ہوا کہ موبائل فون تو حارث کے پاس تھا۔ وہاں کوئی آدمی بھی نہیں آیا۔ پھر حسن خان کو کیسے پتا چلا کہ اس کا بھانجا چھت سے گر گیا ہے؟ وہ رات کو ہماری باتیں سنتا رہا اور پھر اس نے یہ پلان بنایا اور ہم سے پہلے بھاگ لیا۔" "بھئی اسی لیے تو ہم تمھیں کمانڈر کہتے ہیں۔ کمانڈر زندہ باد" حارث کے ابو کہنے لگے۔ "حسن اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے۔ بس غربت اور مسائل نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اب اس نے میرے ساتھ مردوں والا وعدہ کیا ہے کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ میں نے تھانے دار صاحب کو اس کی ضمانت دے دی ہے"۔ اب سب لڑکوں کے چہرے مطمئن نظر آرہے تھے اور وہ کسی اور پراسرار مہم کو سر کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

آیئے مسکرائیں

کرایہ دار (نئے مالک سے): میں نے پچھلا مکان چھوڑا تو مالکہ زار و قطار رونے لگی۔

نئے مالک نے کہا "میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا' میں مکان کا کرایہ پیشگی لے لیتا ہوں (دائس خاں' لاہور)

ٹیکسی ڈرائیور (مسافر سے): جناب میں میٹر چلانا بھول گیا ہوں اس لیے سمجھ نہیں آتا آپ سے پیسے کتنے لوں؟

مسافر: کوئی بات نہیں ، میں بھی اپنا بٹوہ گھر بھول آیا ہوں (مرزا سہیل اکرام' شاہ کوٹ)

ایک آدمی فرنیچر کی دکان میں بہت غصے سے داخل ہوا اور کہنے لگا "آپ کی دکان سے کرسی گھر لے جاتے ہی ٹوٹ گئی"۔

دکان دار: اس پر کوئی بیٹھ گیا ہو گا، ویسے ہمارے ہاں کرسیاں اتنی کچی نہیں ہوتیں (عرفان سنی' شیخوپورہ)

ایک بچے نے دوسرے سے کہا "آج مجھے پچاس پیسے کا سکہ ملا ہے"۔

دوسرے نے کہا "وہ تو میرا تھا"۔

پہلا بولا: ارے جاؤ' مجھے تو پچیس پچیس پیسے کے دو سکے ملے ہیں۔

دوسرے بچے نے جلدی سے کہا "تو کیا ہوا' میرا سکہ گر کر ٹوٹ گیا ہو گا۔ (سمیہ حریم اسلام آباد)

پہلا دوست: تم مٹی کے برتن کیوں پسند کرتے ہو؟

دوسرا دوست: اس لیے کہ اگر گر جائیں تو اٹھانے کی تکلیف نہیں ہوتی۔ (خوش بو فاطمہ، سیال کوٹ)

امی (منی سے): ارے منی املی آنکھیں بند کر کے کیوں کھا رہی ہو؟

منی بولی "میں نے اپنی استانی سے وعدہ کیا تھا کہ آیندہ املی کی طرف دیکھوں گی بھی نہیں (زنیر بٹ لاہور)

بیٹی: امی' میں عائشہ کے گھر جا رہی ہوں۔

ماں: بیٹی! جاؤ لیکن جب تک گاڑی نہ گزر جائے سڑک پار نہ کرنا۔

بیٹی چلی گئی مگر آدھے گھنٹے کے بعد واپس آ گئی۔

ماں: بیٹی اتنی جلدی کیوں آ گئی؟

بیٹی: سڑک سے کوئی گاڑی نہیں گزری۔

(خوش بو فاطمہ سیال کوٹ)

ایک شخص ہیلمٹ والی دکان پر گیا اور دکان دار کو ہیلمٹ دکھانے کے لیے کہا۔ پھر ان صاحب نے قیمت پوچھی۔ دکان دار نے 1500 روپے بتائی۔ ان صاحب نے کہا "مجھے تو کوئی سستے والا ہیلمٹ دکھایئے"۔

دکان دار اس سے کم اور مزید کم کے ہیلمٹ دکھاتا رہا مگر گاہک اور بھی سستا مانگنے لگا۔ آخر اس نے ایک سبز رنگ کا ہیلمٹ دیا اور کہا "صرف 20 روپے کا"۔

گاہک نے فوراً خرید لیا اور پوچھا "آپ اتنے سستے ہیلمٹ کیسے تیار کر لیتے ہیں؟"

دکان دار نے جواب دیا "ہم چار روپے کا تربوز لیتے ہیں' گودا نکال کر کھا لیتے ہیں' باقی کے دو ہیلمٹ بن جاتے ہیں۔ (غزالہ شکیل ملتان)

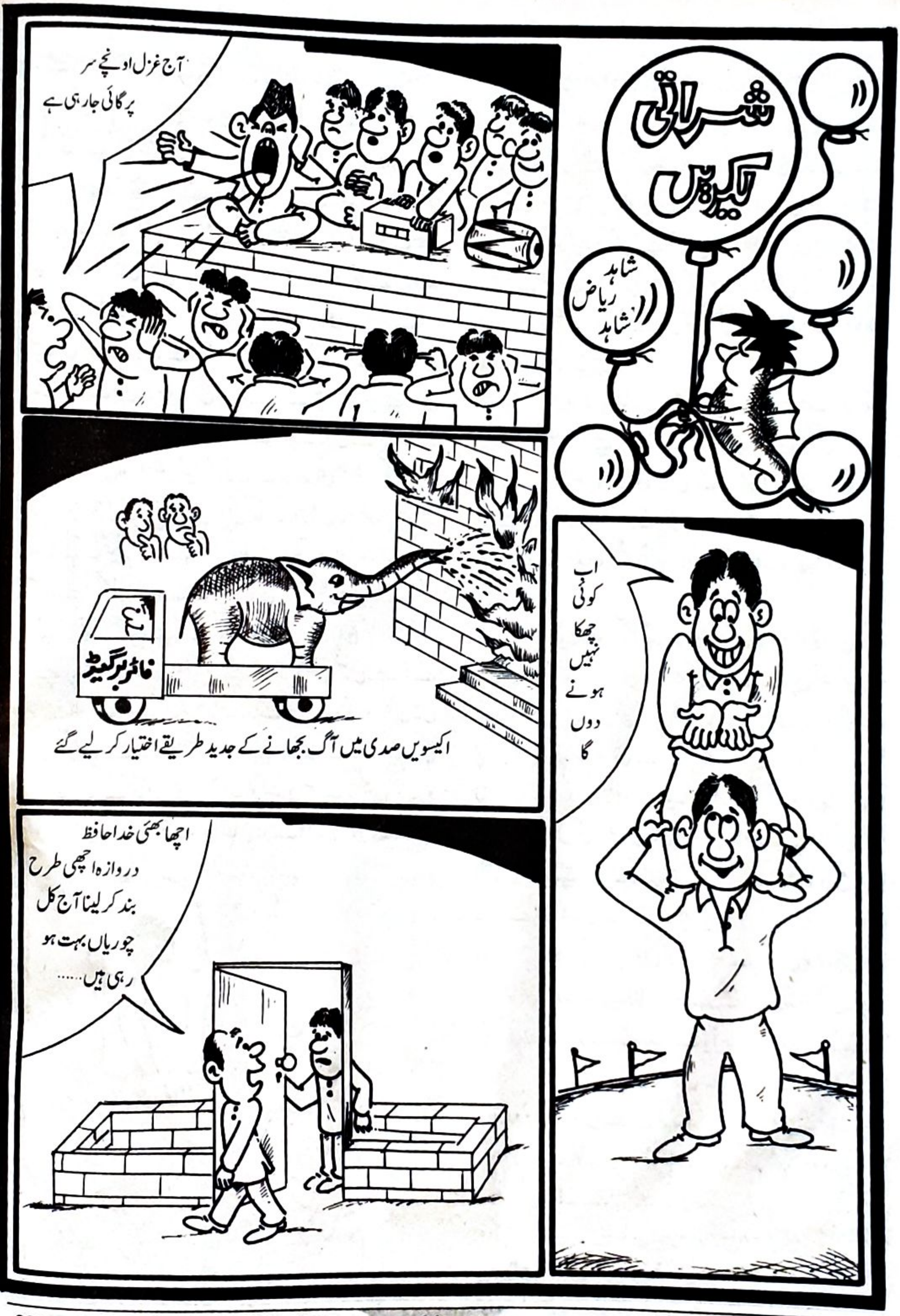
شرارتی لکیریں
شاہد ریاض شاہد
آج غزل اونچے سر پر گائی جا رہی ہے
اب کوئی چھکا نہیں ہونے دوں گا
فائر بریگیڈ
اکیسویں صدی میں آگ بجھانے کے جدید طریقے اختیار کر لیے گئے
اچھا بھئی خدا حافظ دروازہ اچھی طرح بند کر لینا آج کل چوریاں بہت ہو رہی ہیں......

محمد ادریس قریشی

Sharjeel Ahmed

چچا حیرت بڑے پھنسے

چچا حیرت کی نظریں ایک خط پر جمی تھیں اور ان کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔

چچی نے کہا "کیا بات ہے، کس کا ہے یہ خط؟"

"لو بیگم! تم بھی پڑھ لو، یوں سمجھو کہ بس برے دن آگئے ہیں ہمارے" چچا نے رونی آواز میں کہا۔

چچی پرائمری پاس تھیں۔ انہوں نے خط لے کر اس پر نظریں دوڑائیں تو خوشی سے چیخ اٹھیں "آہا...... مزا آگیا، بھائی جان جمال آرہے ہیں، راولپنڈی سے"۔

"ہاں بیگم، اور وہ اپنی بیگم اور نو عدد بچوں کو بھی ساتھ لا رہے ہیں۔ حیرت ہے انہیں یہ کیا سوجھی" چچا نے منہ بنایا۔

"تو آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور پھر میرے یہ بھائی تو کم از کم 10 سال بعد ہمارے ہاں آرہے ہیں" چچی مسکرائیں۔

چچا برا سا منہ بنا کر اپنے کمرے میں گھس گئے۔ اسی وقت صحن میں ان کی مرغیاں بولنے لگیں۔ "کٹ کٹ کٹاک...... کٹاک"۔

چچا فوراً باہر آئے اور بولے "دیکھو بیگم! پہلے ہی ہمارے دو مرغ قربان ہو چکے ہیں، اب میں اپنی اٹھارہ مرغیاں کسی طور پر ضائع نہیں ہونے دوں گا"۔

چچی خاموش رہیں۔ پچھلے دنوں چچا کی ایک مرغی نے انڈوں سے آٹھ چوزے نکالے تھے، جو اب اچھی بھلی مرغیاں بن گئی تھیں۔ اس طرح چچا کے پاس اب اٹھارہ مرغیاں تھیں۔ چچی کے بھائی جمال نے لکھا تھا کہ وہ اتوار کے روز آرہے ہیں۔ ہفتے کے روز چچا نے چچی سے سرگوشی کے انداز میں کہا "میرا خیال ہے بیگم ہمیں اپنی مرغیاں "دینے" کے گھر میں چھپا دینی چاہئیں۔ حیرت ہے یہ خوب صورت خیال پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟"

چچی نے کہا "میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کچھ مرغیاں مہمانوں کے لیے پکانا بھی پڑ گئیں تو کیا حرج ہے"۔

"حرج ہے...... میں اپنی ایک بھی مرغی ذبح نہیں ہونے دوں گا" چچا چیخ پڑے۔

چچی خاموش ہو گئیں۔ وہ چچا کی ضد سے بخوبی واقف تھیں۔

چچا گھر سے باہر نکل گئے اور اپنے پڑوسی دینے کے پاس آپہنچے "بھئی دینے! بات یہ ہے کہ چند روز کے لیے ہمارے ہاں مہمان آرہے ہیں۔ انہیں جانوروں سے سخت چڑ ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم ہماری مرغیاں اپنے ہاں رکھ لو۔ پہلے بھی تو تم ہی یہ تعاون کیا کرتے ہو"۔

بس پھر کیا تھا، چچا گھیر گھار کر مرغیاں دینے کے گھر چھوڑ آئے اور اپنے گھر آکر بے فکری سے بولے "لو، اب کچھ سکون ملا ہے مجھے:

دال ہی کھائے گا آکر اپنا ہو یا غیر ہو
یا الٰہی! میری ساری مرغیوں کی خیر ہو"

چچا نے شعر پڑھا اور خوشی سے چٹکیاں بجانے لگے۔
اتوار کے روز دن کے گیارہ بجے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ چچا اور چچی گھر کے دروازے کی طرف بڑھے۔ چچا بولے "ارے بھئی آ گئے آپ! حیرت ہے کمال ہے"۔
"کمال نہیں، آپ کا بھائی جمال ہے" باہر سے آواز سنائی دی۔

چچا نے دروازہ کھولا تو سب مہمان اندر گھس آئے۔ سلام دعا کی آوازوں سے ان کا گھر گونج اٹھا۔ سب چچا اور چچی سے گلے ملے۔ چچی نے اپنی جمع پونجی سے ان کے لیے بوتلیں منگوائیں اور چائے بنائی۔ دوپہر کے کھانے میں انہیں مسور کی دال پیش کی گئی۔ شام کے کھانے میں جب پھر مسور کی دال سامنے آئی تو جمال صاحب کے بچے جو سب لڑکے تھے، منہ بنانے لگے۔ ان کی والدہ نے انہیں گھور کر دیکھا تو وہ صبر شکر کر کے کھانے لگے۔

رات کو جمال صاحب نے کہا "بھائی صاحب چلو تھوڑی سی آؤٹنگ کر آتے ہیں"۔

ایک فالودہ فروش کی دکان آئی۔ بہت سے لوگ بیٹھے فالودہ کھا رہے تھے۔ جمال صاحب کا دوسرا لڑکا بول اٹھا۔ "انکل چلو فالودہ ہی کھلا دیں"۔

چچا گھبرا کر بولے "ارے بھئی توبہ کرو توبہ! پچھلے مہینے ہمارے پڑوس کے چار آدمی یہ فالودہ کھا کر مر گئے۔ انہیں ملیریا ہو گیا تھا"۔

جمال صاحب بول اٹھے "بھائی صاحب، ملیریا تو مچھروں سے ہوتا ہے۔ فالودے سے اس کا کوئی تعلق نہیں"۔
"ارے بھئی، فالودے میں مچھر وغیرہ گر جاتے ہیں۔ یہ لوگ صفائی کا تو خیال نہیں رکھتے۔ بس الابلا چیزیں لوگوں کو کھلا کھلا کر بیمار کر دیتے ہیں"۔ چچا نے دلائل دے ڈالے اور تیز تیز چلنا شروع کر دیا تاکہ فالودے کی دکان پیچھے رہ جائے۔
چند قدم چل کر ایک ٹھیلے پر گول گپے فروخت ہو رہے تھے اور تین چار آدمی کھا رہے تھے۔
جمال صاحب کا تیسرا لڑکا بولا "انکل میرا خیال ہے گول گپے کھانے میں تو کوئی حرج نہیں"۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں" چچا بولے۔
سب سڑک پر چلتے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ بورڈ لگا تھا "خالص کھوئے کی کھیر"۔
ایک لڑکا بولا "انکل! کھیر تو کھلائیں ہمیں"۔
چچا کے منہ میں پانی آ گیا مگر جلدی سے بولے "ارے بھئی! یہ کھیر تو نری ہیپاٹائٹس ہے۔ پچھلے ہفتے ہمارے محلے کے تین بچے یہ کھیر کھانے سے مر گئے"۔
چند قدم کے فاصلے پر

چچا فوراً چیخے "اللہ کی پناہ! گول گپے کھانا تو خود بیماری کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ہمارے ایک ہمسائے نے پرسوں غلطی سے گول گپے کھا لیے' بس پھر کیا تھا' بے چارہ دو ہفتے سے ہسپتال میں پڑا ہے"۔

یہ سن کر سب کے منہ سے ایک قہقہ نکلا۔

جمال صاحب نے کہا "کوئی بات نہیں بھائی صاحب! آج تو ہم کھا ہی لیتے ہیں" یہ کہہ کر انہوں نے 50 کا نوٹ گول گپے والے کے حوالے کیا اور وہ ان سب کے سامنے گول گپوں کی چنگیریں رکھنے لگا۔

چچا حیرت نے کہا "میرا خیال ہے کہ موت تو ایک دن آنی ہی ہے گول گپے اتنی بری چیز بھی نہیں"۔ یہ کہہ کر انہوں نے جلدی جلدی گول گپوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ مرچ مسالے والا پانی ان کے منہ سے نکل نکل کر کپڑوں پر گرتا رہا۔ گول گپوں سے فارغ ہو کر وہ واپس لوٹے تو جمال صاحب نے کہا "فالودہ کھاتے ہیں یار"

سب اندر گھس گئے۔ جمال صاحب نے آرڈر دیا۔ چچا حیرت نے فالودے کے پیالے میں چمچہ گھماتے ہوئے کہا "بیماریاں تو زندگی کا ایک حصہ ہیں' آدمی کو کھاتے پیتے رہنا چاہیے"۔

فالودہ کھا کر انہوں نے قریبی پارک کی تھوڑی سی سیر کی اور پھر کھیر کی دکان پر آ گئے۔

جمال صاحب نے کہا "کیا خیال ہے' کھیر بھی کھائی جائے"۔

چچا حیرت جھٹ بول پڑے "ہاں ہاں ہیپاٹائٹس کی خیر ہے' اب تو اس کی ویکسین بھی آسانی سے مل جاتی ہے"۔

ان سب نے کھیر بھی چٹ کر ڈالی۔ چچا کی ڈاڑھی پر بھی کھیر لگی ہوئی تھی۔ جمال صاحب نے گھر میں موجود دونوں خواتین کے لیے بھی کھیر پیک کروائی پھر سب گھر واپس آ گئے۔

اگلے دن صبح ناشتے میں مہمانوں کو چائے اور رسک پیش کیے گئے۔ چچی نے چچا کو الگ لے جا کر کہا "آپ اتنے بھی کنگال نہیں جتنا ظاہر کر رہے ہیں۔ آپ کے پاس پیسے ہیں۔ مہمانوں سے اچھا سلوک کرنا چاہیے بلکہ مہمان کی خاطر تواضع تو قرض لے کر بھی کرنے کا حکم ہے"۔

"بس بس' تم مولون بننے کی کوشش مت کرو" چچا نے کہا اور بازار جا کر ٹنڈے لے آئے۔ چچی کو مجبوراً وہی پکانے پڑے۔ لڑکوں نے ٹنڈے دیکھ کر منہ بنا لیے لیکن چار و ناچار کھانے پڑے۔ اسی طرح شام کو بھی وہی ٹنڈے ان کے سامنے رکھے گئے۔ اس شام احتجاجاً وہ سیر کو بھی نہیں گئے۔ سب لڑکے منہ بنائے ادھر ادھر بیٹھے رہے۔ جمال صاحب دس سال بعد آئے تھے' اس لیے وہ دو تین روز رہنا چاہتے تھے۔ رات کے وقت چچا حیرت بینگن لے کر گھر میں داخل ہوئے اور زور سے بولے "لو بھئی بیگم کل کے لیے بینگن آ گئے ہیں پانچ روپے کا ڈھیر مل گیا ہے' یہ فائدہ ہے شام کی خریداری کا' حیرت ہے لوگ صبح صبح مہنگی سبزیاں کیوں خرید لیتے ہیں"۔

چچی نے شرمندگی سے کمرے کی طرف دیکھا کہ کہیں جمال صاحب اور ان کی بیگم نے تو نہیں سن لیا' ہوا بھی یہی' وہ سب لوگ سن چکے تھے کہ اگلا دن بینگن لے کر طلوع ہونے والا ہے۔

رات کو سب سو گئے مگر لڑکے آپس میں کافی دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے۔ صبح جب چچا اٹھے تو انہوں نے دیکھا کہ سب لڑکے صحن میں ایک چادر بچھائے بیٹھے ہیں اور انہوں نے دیوار پر ایک کاغذ بھی چسپاں کر رکھا ہے جس پر موٹے مارکر سے لکھا ہوا ہے "بھوک ہڑتال"۔

"ارے بھئی حیرت ہے' یہ کیا ہے؟ کمال ہے!" چچا چیخے۔

ایک لڑکا چچا کی بات ان سنی کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور تقریر کرتے ہوئے بولا:

"پیارے بھائیو! اس گھر میں جب سے ہم آئے ہیں یہاں پر دال نے ڈیرے ڈالے رکھے۔ یہاں پر ٹنڈے براجمان ہو چکے ہیں۔ یہاں پر بینگنوں کی اجارہ داری قائم ہونے والی ہے۔ ہم اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ خدارا ہم پر رحم کیا جائے' اور ان سب چیزوں کو گھر سے نکال کر مرغ اور بکرے کے گوشت کو

بھی جگہ دی جائے"۔

ایک اور لڑکا اٹھ کھڑا ہوا' اور نعرہ لگایا

"دال سے"۔

"جان بچاؤ" باقی سب نے جواب دیا۔

"ٹنڈے سے"

"جان بچاؤ"

"بینگن سے"

"جان بچاؤ"

لڑکوں کے ماں باپ اور چچا حیرت کی بیگم بھی حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ چچا نے گھبرا کر کہا "بیٹو! تمہاری یہ بھوک ہڑتال کب تک جاری رہے گی؟"

تقریر کرنے والے لڑکے نے کہا "ہماری بھوک ہڑتال بھوک لگنے تک جاری رہے گی"۔

ادھر یہ بھوک ہڑتال جاری تھی ادھر پڑوس میں دینے اور اس کی بیوی کا جھگڑا ہو رہا تھا۔ "یہ چچا حیرت کی مرغیوں کا تم نے ٹھیکا لے رکھا ہے کیا؟ تین دن سے گھر میں گند ڈال رکھا ہے انہوں نے...... اور پھر دانہ دنکا بھی انہیں ہم ہی ڈالتے ہیں۔ میں کہتی ہوں فوراً مرغیاں واپس دے کر آؤ ورنہ میں انہیں ذبح کر دوں گی"۔

دینے نے گھبرا کر کبوتروں والا جال اٹھایا' اس میں ساری مرغیاں ڈالیں اور چھت پر چڑھ گیا۔ چچا حیرت کی چھت ساتھ ملی ہوئی تھی۔ ان کی چھت پر آ کر دینے نے نیچے جھانکا اور غصے سے بولا "لو بھئی حیرت اب تو حد ہو گئی' پکڑو اپنی اٹھارہ مرغیاں' ہم سے نہیں سنبھالی جاتیں" یہ کہ کر اس نے جال الٹ دیا۔

مرغیوں کے کٹ کٹ کٹاک کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ان کے بے شمار پر فضا میں بکھر گئے۔ صحن میں بھوک ہڑتالی لڑکوں پر مرغیاں آگریں۔ ایک لمحے کو تو وہ بھونچکے رہ گئے۔ پھر ان سب نے دو دو مرغیاں پکڑ لیں اور خوشی سے جھومنے لگے۔ ایک لڑکا بولا۔

"اٹھارہ مرغیاں ہیں اور ہم ہیں اللہ اللہ!!"

اگر سچ پوچھیے تو یہ بھی کم ہیں اللہ اللہ

چچا حیرت کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔

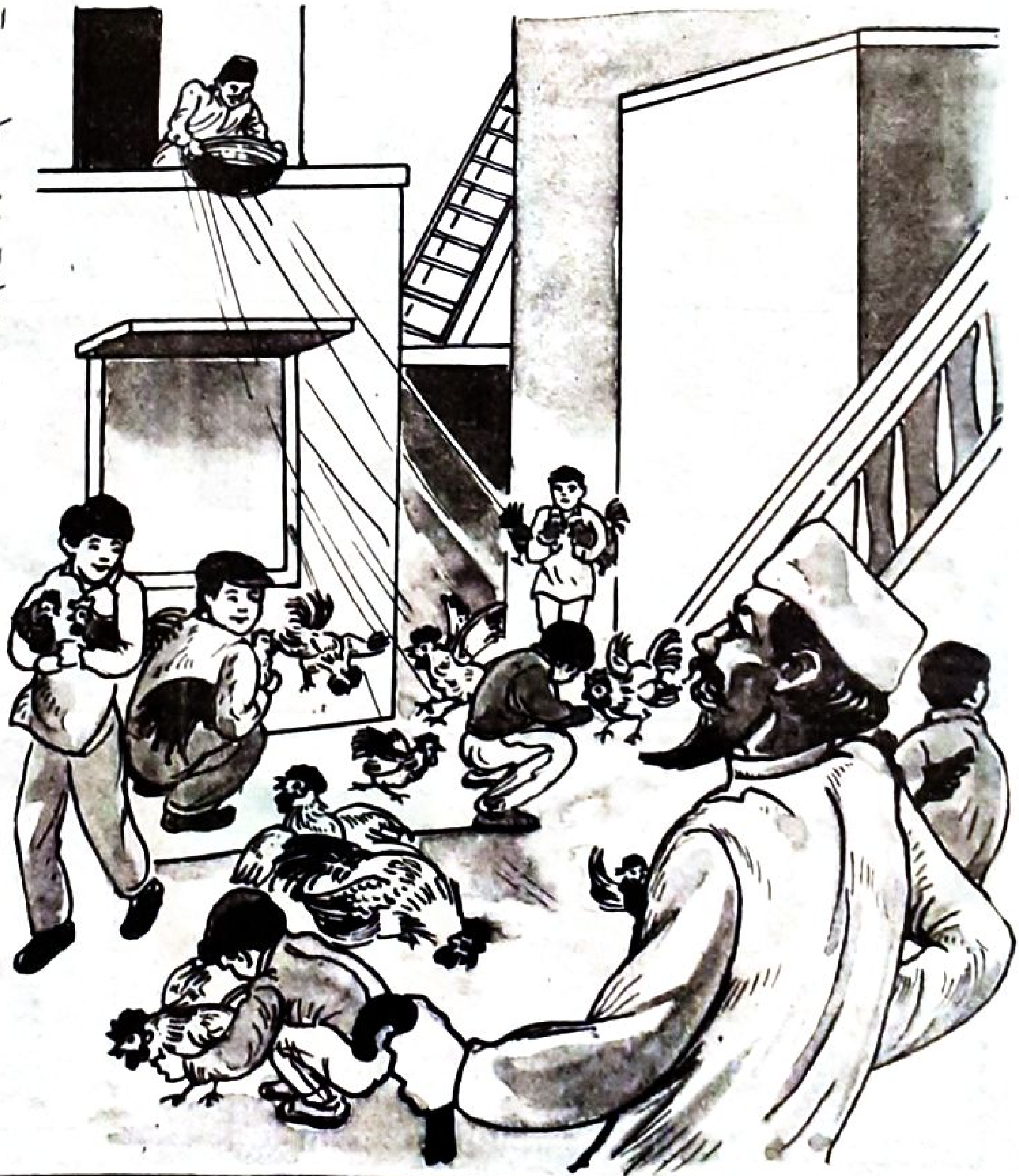

گندم پیسنے والی چکی

1 ہما قادر راول پنڈی (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

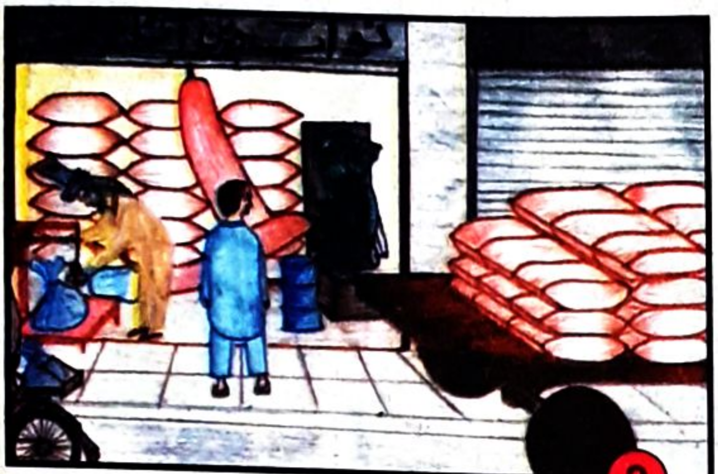

2 محمد عمیر مرزا فیصل آباد (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

3 محمد عثمان مرزا فیصل آباد (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

4 اولیس حیات راول پنڈی (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

5 عبید الرحمان ضیا کسوال (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

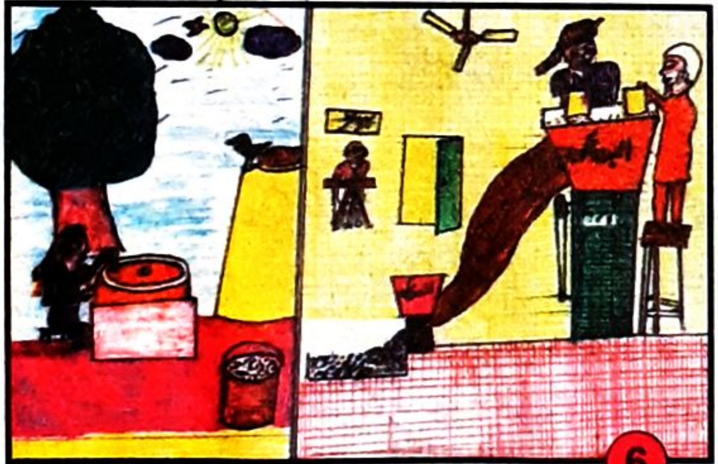

6 شعیب اقبال راؤ لاہور (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:۔ انیلہ شبیر میرپور آزاد کشمیر۔ اسماء رزاق سنجوال چھاؤنی۔ سعدیہ رفیق فاروق آباد۔ ارسلان عثمان گجرات۔ طارق محمود گوجرانوالہ۔ اعزاز علی راول پنڈی۔ محمد خالد شاہین جمال پور۔ محمد شایان خان رجڑ چارسدہ۔ علی طاہر سیال کوٹ۔ شاہ نواز انجم لاہور۔ انم نواز گلشن راوی لاہور۔ صائمہ نورین پشاور۔ سارہ سمیع چک نمبر 87اے' آر منڈھالی شریف۔ مزمل حسین اکمل نون روڈہ۔ خضر ظہیر فیصل آباد۔ عادل انیس کوہاٹ۔ عبدالواجد ہری پور ہزارہ۔ صالحہ اقبال کراچی۔ نایاب گوہر ٹیکسلا۔ ساجد علی تبسم بہاول پور۔

نومبر کا موضوع: مصور پاکستان — آخری تاریخ 17 اکتوبر

دسمبر کا موضوع: بانی پاکستان — آخری تاریخ 7 نومبر

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور اپنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آپ بھی لکھیے

شکر کے آنسو

محمد بلال شریف، ہنگو

"ہندوؤں نے انگریزی عدالت میں مسلمانوں پر مقدمہ کر دیا"۔

یہ خبر آن کی آن میں ساری مسلمان بستی میں پھیل گئی۔ بے شمار لوگ گھروں سے نکل آئے۔ سب کے چہروں پر ایک ہی سوال تھا۔

"اب کیا ہوگا؟"

جھگڑا زمین کے ایک ٹکڑے کا تھا۔ زمین مسجد کے ساتھ تھی۔ مسجد چھوٹی تھی اور نمازیوں کی تعداد زیادہ، انہوں نے ساتھ والی زمین کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پھر کسی نے اس کے گرد چار دیواری بنوادی۔ چار دیواری بنتے دیکھ کر محلے کے نے شور مچادیا۔ "زمین کا یہ ٹکڑا ہندوؤں کا ہے"

ہندو گھرانے یہاں اپنی بھینسیں باندھا کرتے تھے۔ پھر جب مسلمانوں نے یہاں مسجد بنائی تو انہوں نے مسجد کے احترام کی وجہ سے بھینسیں باندھنا بند کر دیں۔ ایک عرصہ اس طرح گزر گیا۔ اب مسلمان باقاعدہ اس جگہ پر قبضہ کر چکے تھے۔

"نہیں نہیں یہ غلط ہے، یہ جگہ شروع سے مسجد کی ہے جو مسجد کے ساتھ ہی مسلمانوں نے خریدی تھی"۔

"غلط، جگہ ہندوؤں کی ہے اور انہوں نے خریدی تھی"۔

جھگڑا بڑھتا چلا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور خنجر لہرانے لگے۔ ایسے میں دو بوڑھے ان کے درمیان آگئے۔

"بھائیو! کیوں خون خرابہ کرتے ہو؟ اس معاملے کو عدالت میں کیوں طے نہیں کر لیتے؟"

چناں چہ ہندوؤں نے مقدمہ درج کرادیا۔ انگریز مجسٹریٹ کے سامنے پہلی پیشی ہوئی۔ اس نے دو طرفہ بیانات سنے اور آخر میں کہا۔

"ٹھیک ہے اگلی تاریخ پر مسجد کے امام کو عدالت میں حاضر کیا جائے۔ اگر اس نے یہ بیان دے دیا کہ زمین مسلمانوں کی ہے تو ان کو دے دی جائے گی ورنہ ہندوؤں کے پاس رہے گی"۔

مجسٹریٹ کے اس بیان نے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ہندوؤں کے منہ لٹک گئے، کیوں کہ اب ان کی شکست بالکل یقینی تھی۔

آخر فیصلے کی تاریخ آگئی۔ تمام مسلمان اور ہندو عدالت میں پہنچ گئے۔ مجسٹریٹ نے مسجد کے امام کو طلب کیا۔ سب سے پہلے امام سے حلف لیا گیا۔

"میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا"۔

اس کے بعد مجسٹریٹ نے ان سے سوال کیا۔

"اب آپ بتائیے یہ جس زمین کے ٹکڑے کا جھگڑا ہے، وہ ٹکڑا کس کا ہے؟ مسلمانوں کا یا ہندوؤں کا؟"

"وہ ٹکڑا ہندوؤں کا ہے، یہ بات بالکل درست ہے"۔

"کیا؟" مجسٹریٹ کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"کیا؟" تمام مسلمان بھی خاموش نہ رہ سکے پھر عدالت میں موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا۔ مجسٹریٹ نے فیصلہ سنا دیا۔

"زمین ہندوؤں کی ہے، انہی کے قبضے میں رہے گی"۔

بوڑھا امام عدالت کے کمرے سے نکلا تو مسلمانوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

"بوڑھے خبیث تو نے یہ کیا کیا، مسلمانوں کی ناک کٹوا دی"۔ بے شمار آوازیں ابھریں۔ "مارو اسے، مارو"۔ "ہاں ٹھیک ہے، یہ بیان دینے کا کچھ صلہ ملنا چاہیے اسے"۔

پھر ان کے ہاتھ اٹھ گئے اور بوڑھے امام کے جسم پر تابڑ توڑ انداز

میں پڑنے لگے۔ وہ بہت خاموشی سے پٹتا رہا۔ منہ سے ایک لفظ نہ بولا۔ مسلمانوں کا غصہ کم ہوا تو اسے زخمی حالت میں چھوڑ کر چلتے بنے۔ وہ گرتے پڑتے مسجد پہنچا۔ زخموں سے خون رس رہا تھا۔ اس سے جو کچھ مرہم پٹی ہو سکتی تھی کی اور ظہر کی اذان دی لیکن ایک مسلمان بھی اس کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں نہ آیا۔ اسے بہت رنج ہوا' آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عصر کا وقت ہوا۔ عصر کی اذان دی لیکن اب بھی کوئی مسلمان نماز ادا کرنے نہ آیا۔ مغرب کا وقت ہوا' اس نے اذان دی اور نماز کی نیت باندھ لی کیوں کہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی مسلمان نماز پڑھنے نہیں آئے گا۔ نماز پڑھ کر اس نے دائیں طرف سلام کے لیے منہ پھیرا تو حیران رہ گیا۔ بائیں طرف پھیرا تو حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ پوری مسجد ہندوؤں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے ادب سے بیٹھے تھے۔

"آپ لوگ اور یہاں؟ خیر تو ہے؟" مسجد کا امام بولا۔

"ہم سب نے ایک فیصلہ کیا ہے" ایک بوڑھے ہندو نے کہا۔ "آپ کے کردار نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے' آپ کی سچائی نے ہمیں خرید لیا ہے' ہم سب مسلمان ہونا چاہتے ہیں اور یہ زمین بھی مسجد کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں"۔

"کیا؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

امام صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور آنسو ان کے گالوں پر لڑھک گئے۔ یہ شکر کے آنسو تھے

(پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

تلاش

محمد عرفان آفریدی' کراچی

"اے بیٹا...... بات سن" بارلیش بوڑھے نے راہ چلتے ایک شخص کو روکا۔ بوڑھے کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے دیوانوں کی طرح سوال کیا: "پتر! یہ پاکستان کو کون سی گڈی (گاڑی) جاتی ہے"۔

"او بابا جی! ہمیں معاف کیوں نہیں کرتے۔ سو مرتبہ بتایا ہے کہ یہی پاکستان ہے"۔

"نہ...... نہ بیٹا جی' میرا مطبل (مطلب) ہے کہ وہ پاکستان جسے قائداعظمؒ نے بنایا' جس کی مٹی میں میرے مسلمان پائیوں (بھائیوں) کا خون شامل ہے" بوڑھے بابا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"بابا جی' یہ وہی پاکستان ہے جسے قائداعظمؒ نے بنایا اور جس کی خاطر لاکھوں مسلمانوں نے قربانیاں دیں۔ تو سمجھتا کیوں نہیں بابا" اس شخص نے اکتا کر یہ کہا اور چل دیا۔ اب بابا جی رندھی ہوئی آواز میں چلا رہے تھے "جھوٹ بولتے ہو...... تم مجھے میرے پاکستان کا پتا کیوں نہیں بتاتے۔ پاگل ہو تم سب...... سب پاگل ہو"۔

یہ ایک بوڑھے شخص کا مختصر قصہ تھا جس کی زندگی کا ہر باب مظلومیت کے الفاظ سے لکھا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہی وہ ایسے مظالم کا شکار رہا کہ جس کا ذکر بہت ہی دل سوز ہے۔ پے در پے صدموں نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ صرف یہی نہیں اس کی طرح اور بھی بہت سے ہوں گے جنہیں پاکستان میں رہ کر بھی پاکستان کی تلاش ہو گی۔ یہ وطن ہمارے پاس ہمارے بزرگوں کی امانت ہے۔ ہم اس کے امین ہیں۔ مگر یہ کیا' اس کے امین ہی اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ 54 سال ہو گئے ہیں اس ارض پاک کو وجود میں آئے ہوئے مگر اس کے باوجود یہاں دہشت گردی کا دور دورہ ہے۔ کرپشن' لوٹ مار' قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ اسلامی قوانین سر عام کچلے جا رہے ہیں۔ ہر چیز میں ملاوٹ کر دی گئی ہے۔ تاریخ میں' خیال و روایات میں' اخلاق و کردار میں' تہذیب و ثقافت میں' جان بچانے کی دواؤں میں اور زندگی بسر کرنے والی غذاؤں میں' کیا یہ آزادی اسی لیے حاصل کی گئی تھی کہ ہم اس سرزمین پاک کی جڑوں کو کھوکھلا کریں' دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹیں اور اس کے وقار پر دھبہ بنیں۔ اس وطن کو تو ہم نے عظیم سے عظیم تر بنانا تھا کیوں کہ یہ لاکھوں شہیدوں کا نذرانہ دے کر آزاد ہوا تھا۔ ہمیں اب بھی عہد کرنا چاہیے کہ اپنے ملک سے تمام برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ اس سے پہلے کہ حرص و ہوس کا یہ طوفان ہمیں بہا کر لے جائے اگر ہم نے یہ نہیں کیا تو پھر اس پاکستان کو کبھی بھی تلاش نہ کر سکیں گے جس کا خواب ہمارے بزرگوں نے دیکھا تھا (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

ایمان داری کا پیکر

عبدالرؤف' پشاور

ساتھیو! آج میں آپ کو ایک عظیم ایمان دار شخص کی کہانی سناتا ہوں۔ یہ عظیم شخص ایک دن کسی کام سے کراچی سے باہر جا رہے تھے۔ انہوں نے ریلوے کا ٹکٹ لیا اور سوار ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد ٹکٹ چیکر آیا۔ انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ ان کا ٹکٹ گم ہو گیا ہے۔ جیسے ہی ٹکٹ چیکر ٹکٹ چیک کرنے آیا تو انہوں نے ساری بات بتا دی اور نیا ٹکٹ لینے کے لیے پیسے دیئے۔ ٹکٹ چیکر نے کہا "نیا ٹکٹ لینے کی ضرورت نہیں بس آپ مجھے ان پیسوں سے آدھے پیسے دے دیں"

انہوں نے یہ سنا تو غصے سے سرخ ہو گئے اور کہا "تمہیں شرم نہیں آتی ہیرا پھیری کرتے ہو اور مجھے بھی اس پر آمادہ کر رہے ہو؟ میں تمہاری شکایت اوپر تک لے جاؤں گا"۔

یہ سن کر ٹکٹ چیکر سخت شرمندہ ہوا۔ اس نے ان سے معافی مانگی ان سے پیسے لے کر ٹکٹ بنا دیا۔

یہ عظیم شخص کون تھے؟ یہ ہمارے عظیم قائد اور رہ نما قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ آپ کراچی میں 25 دسمبر 1876ء میں پیدا ہوئے اور اپنی قابلیت' محنت' ذہانت اور ایمان داری کی وجہ سے جلد ہی مشہور ہو گئے۔ آپ نے پاکستان حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور آخر پاکستان حاصل کر کے ہی دم لیا۔ آپ نے طالب علموں کو نصیحت کی کہ آپ کی بھلائی آپ کے والدین کی بھلائی بلکہ ساری مملکت کی بھلائی اسی میں ہے کہ آپ صرف اپنی تعلیم پر دھیان دیں۔ آپ نے پاکستان کی دن رات خدمت کی جس کی وجہ سے آپ کی صحت بگڑ گئی اور آخر آپ 72 سال کی عمر میں 11 ستمبر 1948ء کو وفات پا گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

کھودا پہاڑ نکلا چوہا

شیریں عظمیٰ رانا' لاہور

میری باجی اپنی ایک عدد بیٹی جو کہ 7 سال کی ہے کے ساتھ ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ اگرچہ ان کی ایک ہی بیٹی ہے لیکن ماشاء اللہ پورے گھر کی رونق ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک دن مغرب کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی اور میری بھانجی صاحبہ اپنی عادت کے مطابق مختلف کھیلوں میں مصروف کمرے میں مٹر گشت کر رہی تھیں۔ یک دم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے سے بلی کے بچے کی آواز آئی ہے۔ میں نے رمات' اپنی بھانجی' کو اس طرف متوجہ کیا۔ ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن کمرے میں کسی بلونگڑے کا نام نشان نہیں تھا۔ یہ بات ہمارے لیے حیرت کا باعث تھی کہ آواز تو صاف آتی محسوس ہوتی لیکن بلونگڑا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال اس بات کا امکان تھا کہ گلونگڑا پلنگ کے نیچے یا الماری میں چھپا ہوا ہو۔

اچھا جناب' اب ہم نے اس صورت حال سے امی اور باجی کو بھی آگاہ کیا اور اس کے بعد بیڈ کے نیچے جھانک کر اور احتیاطاً دوسرے کمروں میں نظر دوڑا کر جائزہ لیا کہ بلونگڑا کی آواز ہو سکتا ہے ذرا دور سے آ رہی ہو کیوں کہ وہ بہت مدھم تھی۔ اس دوران میں جب ہم باورچی خانے میں گئے تو آواز وہاں سے آتی محسوس ہوئی۔ رمات تو اس صورت حال سے ڈر ہی رہی تھی لیکن اب تو ہمارے بھی ہاتھ پیر پھول گئے۔ کیوں کہ ہم نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ بعض اوقات بھوت پریت بلیوں کے روپ میں آ جاتے ہیں۔

رات ہونے کی وجہ سے بات آئی گئی ہو گئی لیکن صبح اٹھنے پر اسی آواز نے پھر ہمیں چونکا دیا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ آواز مجھے اور رمات کو ہی زیادہ محسوس ہوتی۔ اب ہم نے فیصلہ کیا کہ آخر اس معمہ کو حل کر ہی لیا جائے کہ بلونگڑا گھر کے کس کونے میں دبکا بیٹھا ہے۔ ہم نے آستینیں چڑھائیں' ڈنڈا پکڑا اور لگے کبھی بیڈ کے نیچے اور کبھی دروازوں کے پیچھے مارنے۔ رمات بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اب ہم کمرے میں دیکھنے لگے تو آواز وہاں سے بھی آنے لگی۔ ڈرائنگ روم میں چیک کرنے کے لیے گئے تو آواز اس جگہ سے بھی آتی محسوس ہوئی۔ ہماری یہ کارروائی ابو جان بھی دیکھ رہے تھے اور انہیں بھی اس معاملے کا علم ہو چکا تھا چناں چہ انہوں نے بھی ہمارا ساتھ دینے کا ارادہ کیا اور ڈرائنگ روم کے صوفے پلٹ پلٹ کر دیکھنے میں ہماری مدد کی۔ اب تک ہمارا حیرت سے برا حال ہو چکا تھا۔ کیوں کہ بلونگڑے کی آواز بالکل قریب سے آتی محسوس ہوتی لیکن دیکھنے پر وہ وہاں نہ ہوتا۔ آخر ہر جگہ دیکھنے کے بعد ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اب ہم کسی کام سے باورچی خانے میں گئے تو ہماری حیرانی کا کوئی عالم نہ رہا کیوں کہ بلی کے بچے کی آواز وہاں سے آتی محسوس

ہوئی۔ اب تو ہم نے سوچا کہ ضرور کوئی اور بات ہے اور ہمیں دھوکا ہو رہا ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ بلونگڑا چھلاوا تو ہو نہیں سکتا۔ ساتھ ہی رمات بھی کھڑی تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور یہ خیال آیا کہ بلونگڑے کی آواز اسی وقت آتی کیوں محسوس ہوتی ہے جب رمات میرے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ سوچنا تھا کہ میری نظر رمات کی جوتی کی طرف گئی اور یہ راز افشا ہو گیا کہ رمات کی ربڑ کی جوتی دراصل پانی میں بھیگ کر ایسی آواز پیدا کرتی ہے (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

ہائے ری قسمت

نور العین پرویز، لاہور

ایک دن ہمارا موڈ اسکول جانے کا بالکل نہ تھا لیکن ہمارے اور ہماری چھٹی کے درمیان ہماری امی دیوار چین کی طرح حائل تھیں۔ خیر ہم بھی بڑے استاد ہیں، کسی نہ کسی طرح سر درد کی اداکاری کر کے چھٹی کر ہی لی۔ لہٰذا امی سے سر درد کا بہانہ لگا کر ہم نے دوبارہ سر تک چادر تان لی اور گھوڑوں کے بجائے پورا اصطبل بیچ کر سو گئے کیوں کہ مآب دولت کو چھٹی کے روز جلد اٹھنے کی عادت نہیں۔

خیر اللہ اللہ کر کے 11 بجے اٹھے، ابھی تکیے پر سے سر اٹھایا ہی تھا کہ بیڈ کے عین اوپر لگی فریم دار تصویر سے جا ٹکرایا اور ہمیں اپنے اردگرد نیلی پیلی چنگاریاں اڑتی ہوئی محسوس ہوئیں چار و ناچار اٹھ کر کمرے سے باہر نکلے تو ہماری قمیص دروازے کی کنڈی کے ساتھ الجھی اور پھٹ گئی چناں چہ صبح ہی صبح امی کی جھڑکیوں نے ہماری تواضع کی۔ غصے کے مارے زور زور سے پیر پٹختے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھے، دروازہ کھولا اور واش بیسن کی طرف لپکے مگر غصے میں زمین پر پڑا ہوا صابن نظر نہ آیا اور بد قسمتی سے اس پر پاؤں پڑ گیا۔ بس پھر کیا تھا، ہم دھڑام سے نیچے۔ لیکن بات یہاں پر ہی ختم نہیں ہوئی، گرنے کے دوران میں ہمارا سر نل سے جا ٹکرایا اور نل نے اس ناگہانی آفت کی وجہ سے اپنا منہ پوری قوت سے کھول دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نل کے نیچے اور پانی ہمارے سر، منہ اور ناک پر۔

کچھ دیر بعد اپنی مدد کا خیال آیا تو پوری قوت سے چلانا شروع کر دیا۔ میری چیخیں سن کر امی دوڑی آئیں، نل بند کیا اور ہماری بلائیں لینے لگیں۔ اس کے بعد چھٹی کا سارا دن ہم نے بستر پر گزارا اور اپنی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو بہائے (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

اف یہ دن

محمد ذی شان حیدر، واہ چھاؤنی

یہ واقعہ 23 جولائی کو پیش آیا۔ جب پورا پاکستان اور خصوصاً راول پنڈی اور اسلام آباد کام میں مصروف تھا۔ میرے ماموں جو کہ راول پنڈی میں آریہ محلہ میں رہتے ہیں۔ جہاں کبھی سیلاب نہیں آیا تھا، وہاں بھی سیلاب آ گیا۔ گھر میں صرف میری بڑی ممانی اور نانی تھیں۔ ان کے گھر میں چار فٹ سے زائد پانی بھر گیا۔ ان کے گھر کی ہر چیز خراب ہو گئی۔ ان کی واشنگ مشین الٹ گئی، فریج خراب ہو گیا۔ ان کے گھر کے بستر پانی میں گیلے ہو کر خراب ہو گئے۔ فرنیچر تک بھی خراب ہو گیا۔ میری چھوٹی ممانی جو کراچی گئی ہوئی تھیں، ان کے بھی سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ ان کے بچے اسکول کا کام ختم کر کے گئے تھے وہ بھی سارا دھل گیا۔

میرے ماموں ہی کا نہیں بلکہ پورے راول پنڈی اور اسلام آباد میں بہت نقصان ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ راول پنڈی اسلام آباد کے گلی کوچوں میں اللہ کی عبادت کے بجائے کیبل کا دور دورہ ہے۔ اسلام آباد کا نام اسلام پر رکھا گیا ہے لیکن یہاں اسلام تو آباد نہیں ہے، ہاں البتہ کیبل وافر آباد ہے۔ جن گھروں میں اللہ کی عبادت کی جاتی تھی اب وہاں پر کیبل دن رات دیکھی جاتی ہے اور ان کے گھروں میں فرشتوں کے بجائے شیطان کودرہا ہے اور اگر عبادت ہو بھی رہی ہے تو ٹی وی پر کیبل لگی ہوئی تھی اور یا شیطان ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ کیا اسلام نے ہمیں یہ طریقہ بتایا تھا عبادت کرنے کا؟ خاص کر بچے بڑے شوق سے کیبل دیکھتے ہیں۔ اس لیے بچوں کی کتابوں اور کاپیوں کا بہت نقصان ہوا ہے۔ ہم بچوں کو کیبل کی برائی سے بچنا چاہیے کیوں کہ ہم اپنے ملک کا مستقبل ہے (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

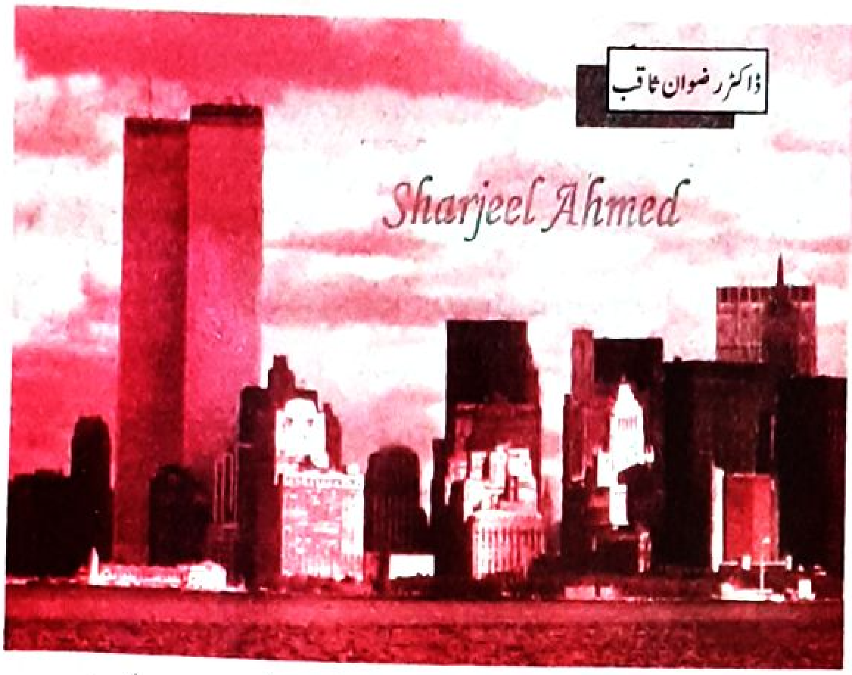

ڈاکٹر رضوان ثاقب

معلومات

ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون

11 ستمبر 2001ء کو امریکا میں دو اہم ترین اور بلند ترین عمارتوں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون سے طیاروں کے ٹکرانے سے آگ لگ گئی۔ آتش زدگی کے اس واقعہ میں ہزاروں افراد زخمی اور ہلاک ہوگئے۔ یہ دونوں عمارتیں اس حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہیں کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر دنیا کا سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے جب کہ پینٹاگون دنیا کی سب سے بڑی دفتری عمارت اور امریکی فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یقیناً آپ ان دونوں عمارتوں کے بارے میں مزید تفصیلات جاننا چاہتے ہوں گے۔ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر (نیویارک)

ورلڈ ٹریڈ سنٹر جو امریکا میں معاشی منصوبوں کی علامت سمجھا جاتا تھا وہ اب موجود نہیں ہے۔ نیویارک میں اس سنٹر کے آسمان سے باتیں کرتے دونوں ٹاور منظر سے غائب ہو چکے ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی کہانی کچھ یوں ہے کہ امریکا کے کچھ بڑے کاروباری حضرات کی یہ خواہش تھی کہ نیویارک میں ایک عالی شان عمارت تعمیر کی جائے۔ لہٰذا دنیا کی اس بلند ترین عمارت کی تعمیر کے لیے یاماساکی نامی ماہر تعمیرات کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انہوں نے کم رقبے پر زیادہ سے زیادہ دفاتر اور شاپنگ سنٹر بنانے کے لیے عمارت کی اونچائی زیادہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس عمارت کو زیر زمین راستوں سے ملانے کی تجویز بھی پیش کی گئی تھی۔ پھر تجویز کیا گیا کہ اس تجارتی مرکز کے ایک ہی ٹاور کا بہت بڑا سائز کچھ غیر منطقی سا لگے گا جب کہ اگر ایک سے زیادہ ٹاور بنائے جاتے تو وہ ایک ہاؤسنگ اسکیم کی طرح نظر آتے۔ لہٰذا یاماساکی نے اس سلسلے میں 100 سے زائد نقشوں کا جائزہ لیا پھر کچھ سوچ بچار کے بعد دو ٹاوروں کے نمونے کو حتمی شکل دی گئی۔ ان دو ٹاوروں میں دفاتر کے لیے 90 لاکھ مربع فٹ کی گنجائش رکھی گئی۔ ایسا ڈیزائن تھا جس سے دل فریب نظارہ بھی کیا جا سکتا تھا' ان دونوں ٹاورز کی الگ الگ اونچائی 1350 فٹ (411 میٹر) تجویز کی گئی جب کہ ہر ٹاور کی 110 منزلیں بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یاماساکی نے پراجیکٹ ملنے کے بعد نیویارک کی فرم ایمرے راتھ اینڈ سنز کے ساتھ مل کر ایک ڈیزائن مرتب کیا پھر اس عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

کچھ عرصہ پہلے ورلڈ ٹریڈ سنٹر دنیا کی سب سے اونچی عمارت تھی اور یہ تباہ ہونے سے پہلے نیویارک میں بلند ترین عمارت تھی جو 64 مربع میٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں ٹاوروں کی آخری منزل پر دوربینیں نصب تھیں جن کی مدد سے ہر سمت میں 45 میل تک دیکھا جا سکتا تھا' یہ اس عمارت کی سب سے منفرد بات تھی۔ اس عمارت کا ڈھانچہ انتہائی سادہ رکھا گیا تھا۔ اس میں 208 فٹ چوڑی اسٹیل کی چادر استعمال کی گئی تھی اور یہ چادر کپڑے کی طرح تیار کی گئی تھی' اس میں کالم بنائے گئے تھے تاکہ آندھی اور طوفان کا آسانی سے مقابلہ کر سکے۔ درمیان میں لوہے کی چوڑائی 39 انچ تھی تاکہ عمارت کو

کشش ثقل (زمین کی چیزوں کو اپنی طرف کھینچنے کی قوت) کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کا کام دے سکے۔ ان ٹاورز کا نقشہ اس قدر مہارت سے بنایا گیا تھا کہ وہ سستا بھی ہو اور ہلکا بھی نیز آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ بھی کر سکے۔ بھاری ہونے کی صورت میں تو یہ عمارت اپنے بوجھ سے بھی گر سکتی تھی۔ بالائی منزلوں پر ہر منزل پر کم و بیش 40ہزار مربع فٹ جگہ دفاتر کے لیے تھی۔ چھت اور فرش اسٹیل کی خصوصی طور پر تیار کی گئی چادروں کی مدد سے بنائے گئے تھے۔ اس سنٹر میں دو طرح کی لفٹیں لگائی گئی تھیں۔ ایک ایکسپریس اور دوسری لوکل سسٹم کہلاتی تھی۔ ان دونوں کو سکائی لابی سسٹم بھی کہا جاتا ہے۔ ایکسپریس لفٹ زمین سے 41ویں اور 74ویں منزل پر رکتی تھی جب کہ یہاں سے مسافروں کو اونچی اور نیچی منزلوں تک پہنچانے کے لیے لوکل ایلی ویٹر سسٹم موجود تھا۔

اس عمارت میں 23 تیز رفتار اور 72 قدرے سست لفٹیں اور سیڑھیاں تھیں۔ اس سنٹر پر کل 90 کروڑ ڈالر کی لاگت آئی تھی اور اس کا ایک ٹاور 1972ء میں جب کہ دوسرا 1973ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اس عمارت میں پچاس ہزار افراد کام کرتے تھے اور ایک لاکھ افراد کی یہاں روزانہ آمد و رفت رہتی تھی۔ یہاں پر 12000 سے زائد تجارتی ادارے قائم تھے، جن میں سے بیشتر بین الاقوامی ادارے تھے۔ ہر ٹاور میں 43200 کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں جن میں 6لاکھ مربع فٹ شیشہ استعمال کیا گیا تھا۔ اس سنٹر میں دو نمائشی ہال اس قدر بڑے تھے کہ ان میں 15 فٹ بال اسٹیڈیم سما سکتے تھے۔ اس عمارت کی 107 ویں منزل سے پورا نیویارک دیکھا جا سکتا تھا۔ ان دونوں ٹاورز کو ٹوئن ٹاور بھی کہا جاتا تھا۔

(2) پینٹاگون (واشنگٹن)

امریکا کے محکمہ دفاع کا صدر دفتر پینٹاگون کا شمار دنیا کی چند مشہور عمارتوں میں ہوتا ہے۔ یہ عمارت رقبے کے اعتبار سے شکاگو کے مرچنڈائزڈ مارٹ سے دوگنی ہے۔ اس میں نیویارک کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کے فلور سپیس سے تین گنا زیادہ گنجائش ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے محفوظ (Most Secured) عمارت ہے۔ اس میں 24ہزار افراد کام کرتے ہیں۔ جن میں فوجی اور سول اہل کار شامل ہیں۔ ان افراد کی ذمہ داری دفاع اور دفاعی اقدامات پر عمل در آمد کرانا ہے۔

پینٹاگون کی عمارت کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں آٹھ ہزار سات سو ستر (8770) کاریں سولہ پارکنگ مقامات پر کھڑی کی جا سکتی ہیں۔ دفاتر تک پہنچنے کے لیے 131 مختلف سیڑھیاں ہیں جو 37 لاکھ پانچ ہزار سات سو 93 مربع فٹ جگہ گھیرتی ہیں۔ عمارت میں 42 سو کلاک لگے ہوئے ہیں۔ 691پانی کے چشمے ہیں۔ 284ریسٹ رومز ہیں۔ روزانہ دو لاکھ کالیں پینٹاگون میں موصول ہوتی ہیں۔ جب کہ یہاں کا ڈاک خانہ 12 لاکھ خطوط اور دیگر مراسلے روزانہ وصول کرتا ہے۔ یہاں نوعیت کی لائبریریاں بھی ہیں جو اہل کاروں کو ریسرچ میں مدد دیتی ہیں۔ ایک فوج کی لائبریری بھی ہے جس میں مخصوص موضوعات پر تین لاکھ سے زائد کتب ہیں اور یہ لائبریری سترہ جرائد بھی شائع کرتی ہے۔ یہ عمارت 16ماہ کے قلیل ترین عرصے میں تعمیر کی گئی اور یہ 15 جنوری 1943ء میں مکمل ہوئی جب کہ اس کی تعمیر پر 83ملین (آٹھ کروڑ 30لاکھ) ڈالر خرچ ہوئے۔

چاند

چاند چمکتے چہرے والا
لے کر اپنے نور کا ہالا
آنے والی شام سے پہلے
ہم سب کے آرام سے پہلے
رات کو روشن کرنے آئے
اپنے ساتھ ستارے لائے
رات ہو چاہے جتنی کالی
بن جائے یہ نور کی تھالی
دور ہی دور سے یہ مسکائے
اور کسی کے پاس نہ جائے
بچوں کے یہ دل کو بھائے
چندا ماموں بھی کہلائے

کرامت بخاری

Sharjeel Ahmed

زبیدہ سلطانہ

آپ ہی اپنے جال میں

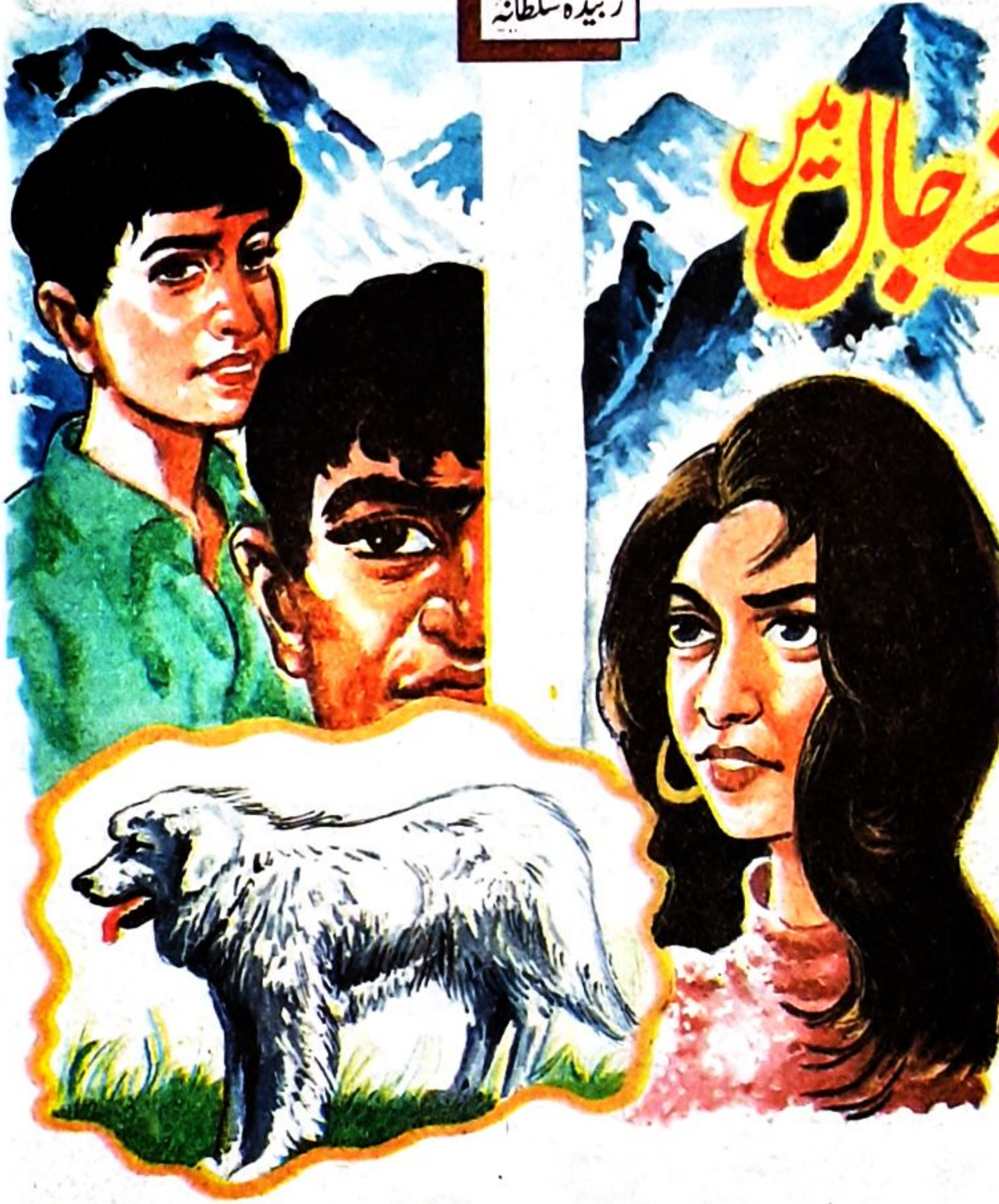

شہر کے ہوائی اڈے پر دو غیر ملکی سیاح اترے۔ ان کے سامان میں کچھ اس قسم کی چیزیں تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مصور ہیں۔ ڈبوں اور بوتلوں میں قسم قسم رنگ وغیرہ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اس علاقہ میں قدرتی مناظر کی تصویر کشی کے لیے آئے ہیں۔ ان کے نام رتن اور مدن تھے۔

رتن اور مدن نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں ساتھ ساتھ دو کمرے کرائے پر لیے۔ چند روز کے بعد ایک نوجوان لڑکی بھی اس ہوٹل میں آئی اور رتن اور مدن کے ساتھ والے ایک کمرے میں ٹھہری۔ وہ جلد ہی ان دونوں سیاح مسافروں سے گھل مل گئی، جیسے پہلے ہی سے ان کی واقف ہو۔ لباس اور شکل صورت سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ وہ کس قوم یا فرقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا نام بھی کچھ ایسا ہی تھا...... "کنول رانا"۔

کنول رانا کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہندو ہے مسلمان ہے یا عیسائی۔ وہ تینوں اکثر اکٹھے نظر آتے۔ صبح ناشتے کے بعد وہ دوپہر کا کھانا لے کر نکل جاتے اور اس نیم پہاڑی علاقے میں دور دور تک سیر کیا کرتے۔ اب ان کا رخ ملک عثمان کی پر فضا کوٹھی کی طرف تھا۔ جو ایک سرسبز پہاڑی کے اوپر کئی کنال کے رقبہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کوٹھی کے چاروں طرف نو فٹ بلند دیوار تھی۔ صنوبر کے اونچے اونچے درختوں میں گھری ہوئی عمارت چار دیواری کے درمیان کھڑی تھی۔ لوہے کے مضبوط گیٹ پر دونوں طرف مسلح چوکی دار ہر وقت موجود رہتے تھے۔ پہاڑی کے اوپر یہ ایک ہی کوٹھی تھی اور پہاڑی کے دامن سے کوٹھی کے گیٹ تک پکی سڑک بنی ہوئی تھی۔

ان تینوں سیاحوں کو یہ پہاڑی بے حد پسند آئی۔ وہ ہر روز اوپر آ کر کوٹھی کے اردگرد کے خوب صورت مناظر کی تصویر بناتے، شام تک اسی علاقے میں کھڑے نظر آتے۔ ملک عثمان کے کارندوں نے ان سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے تصویریں دکھا کر بتایا کہ وہ مصور ہیں، قدرتی مناظر کی تصویریں بنا کر بیچتے ہیں۔ انہوں نے رفتہ رفتہ ملک عثمان کے چند ملازموں سے دوستی کر لی۔ اسی لیے وہ اب انہیں کوٹھی کے گرد منڈلانے سے

نہیں روکتے تھے۔

رتن اور مدن نے ملازموں کے ذریعے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ملک صاحب ان دنوں کچھ بیمار ہیں اور آرام کرنے کے لیے اپنی اس کوٹھی میں آئے ہوئے ہیں۔ ملک صاحب بہت مشہور سیاسی لیڈر تھے اور قوم و ملک کے سچے خیر خواہ وطن پرست تھے۔ اپنے وطن کے دشمنوں کو ہرگز برداشت نہ کرتے تھے۔ بڑے ذہین سیاست دان تھے۔ دشمنوں کی چالاکیوں اور سازشوں کو فوراً سمجھ جاتے اور اپنی پرجوش تقریروں سے قوم کو باخبر کر کے دشمن کی چال بازیوں کو ناکام بنا دیا کرتے تھے۔ اسی لیے وہ دشمن کی آنکھ کا کانٹا بنے ہوئے تھے اور مخالفوں نے ان کو راستے سے ہٹانے کے لیے کئی حربے آزمائے اور ان پر قاتلانہ حملے کرائے تھے۔

خیر ہم ذکر کر رہے تھے رتن مدن اور ان کی ساتھی لڑکی کنول رانا کا۔ انہوں نے ملک صاحب کے پالتو کتے ڈائر کو بھی مانوس کر لیا۔ رتن اسے کباب دیتا تو وہ کباب اٹھا کر گیٹ کے نیچے سے اندر چلا جاتا۔ کنول نے سراغ لگایا کہ ملک صاحب چمن میں کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں تو ڈائر کباب لے کر ان کے قریب بیٹھ کر کھاتا ہے۔

اگلے روز تینوں سیاحوں نے حسب معمول ملک صاحب کی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر اپنا ڈیرہ جمایا، ایزل لگائے، ان پر کینوس جمائے اور تصویریں بنانے میں مصروف ہو گئے۔ ڈائر بھی آن پہنچا اور ان کی کھانے کی باسکٹ کی طرف حریص نظروں سے دیکھنے لگا۔ آخر وہ کام سے فارغ ہو کر جھرنے کی طرف گئے۔ ہاتھ منہ دھویا، جگ میں ٹھنڈا پانی بھرا۔ کنول نے سبزے پر چادر بچھائی اور باسکٹ سے کھانے کا سامان نکال کر دستر خوان پر چن دیا۔ مدن نے آج کباب کے بجائے ایک لمبی سی ہڈی ڈائر کے آگے پھینکی۔ ڈائر نے ہڈی منہ میں اٹھائی اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ کنول کھانا چھوڑ کر اس کے پیچھے لپکی۔ جب وہ گیٹ کے نیچے سے اندر گھس گیا تو واپس آئی۔ رتن اور مدن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر آہستہ سے "ہاں" کے اشارے میں سر ہلایا۔

"تو بس یہ ٹھیک ہے!" رتن نے مدن سے دبی آواز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کل کام نپٹ جائے گا"۔ مدن نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے اس معاملے کو خواہ مخواہ طول دیا"۔ کنول اپنی پلیٹ میں کباب رکھتے ہوئے دبی آواز میں بولی۔

"اور کیا کرتے؟" مدن نے پوچھا۔

"ہر روز تو وہ اس وقت اندر باغ میں بیٹھا ہوتا ہے، دیوار پر سے اندر پھینک دیتے" کنول نے جواب دیا۔

"کی ہے نا آخر وہی کم عقلی والی بات" رتن نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں اس میں کم عقلی والی کون سی بات ہے؟" کنول چڑ کر بولی۔

"ارے بھئی اتنی اونچی دیوار ہے اور وہ کئی گز دور بیٹھا ہوتا ہے۔ راہ میں گھنے درختوں کی رکاوٹ الگ ہے، ایسے تو جان بوجھ کر پکڑے جاتے" رتن بولا۔

"چلو چھوڑو...... شکر کرو اب تو جلد ہی مشکل آسان ہونے والی ہے"۔ مدن نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"کنول تم ابھی واپسی پر ایئرپورٹ جا کر واپسی کی سیٹیں

بک کرالینا۔ کل ہم یہیں سے نکل جائیں گے۔ تم گاڑی لے کر نیچے ہی پہاڑی کے دامن میں ٹھہرنا''۔

رتن نے ذہن میں بیٹھے بیٹھے پورا پروگرام بنالیا۔

اس روز واپسی پر تینوں بہت خوش تھے۔ اپنے خوف ناک مشن میں کام یابی انہیں بہت قریب نظر آرہی تھی۔

یہ آخری رات ان کے لیے بے حد مصروفیت کی تھی۔ مدن اور رتن دیر تک کام میں مصروف رہے۔ کنول نے بچا کھچا سامان کئی قسم کے پاؤڈر اور کیمیکل واش روم میں لے جا کر ضائع کئے۔ خالی ڈبے اور بوتلیں ایک تھیلے میں ڈالیں کہ صبح راستے میں کسی کھڈ میں پھینک دیں گے۔ پھر وہ تیار شدہ ہینڈ بم بھی ناکارہ کر دیئے جو وہ ہر روز کھانے کی باسکٹ میں رکھ کر لے جاتے تھے مگر انہیں استعمال کرنے کا موزوں موقع نہ ملا تھا۔

اگلی صبح جب وہ اپنا سامان سمیٹ کر ہوٹل کا بل ادا کر کے نکلے تو کنول اپنی ایک دوست کی گاڑی میں باہر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ روزمرہ کی طرح وہ کھانے کی باسکٹ اور اپنے ایزل اٹھائے پہاڑی پر پہنچے۔ ہر ایک کے دل میں کچھ عجیب قسم کی کھد بد ہو رہی تھی۔ مقررہ وقت کے قریب آنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ کچھ نا معلوم سی الجھن بھی تھی۔ وقت تھا کہ کٹنے میں نہیں آرہا تھا۔ آخر ان کا نجات دہندہ ڈائر گیٹ والی دیوار کا موڑ مڑ کر ان کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ آج تو وہ کھانا کھانے نہیں بیٹھے تھے کیوں کہ باسکٹ میں ان کا کھانا نہیں تھا' صرف ڈائر کے لیے ایک لمبی سی ہڈی تھی۔ ڈائر کو دیکھتے ہی ایزل اور تصویر کشی کا سامان سمیٹ کر کنول نیچے گاڑی میں لے گئی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگی۔

رتن نے ڈائر کو چمکارا پچکارا' وہ دم ہلاتا ہوا اس کے قریب آگیا اور اس نے لمبی ہڈی نکال کر اس کے آگے ڈال دی۔ مدن نے ترنگ میں باسکٹ کو اچھال کر جھرنے کے اس پار پھینک دیا۔ اب اس کی ضرورت بھی تو ختم ہو گئی تھی۔

مگر یہ کیا؟ ڈائر نے ہڈی کو منہ میں نہیں اٹھایا بلکہ وہیں اسے الٹ پلٹ کر سونگھنے لگا۔ پھر جیسے سوالیہ نظروں سے رتن کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کیا ہے؟ اس کے بعد وہ جھنجھلا کر ہڈی کو بھنبھوڑنے لگا۔ رتن نے چاہا کہ لپک کر اس ہڈی کو کتے سے واپس چھین لے مگر کتے نے اسے منہ میں پکڑ لیا۔ مدن نے رتن کی آستین پکڑلی اور سرگوشی میں کہا''وہ لے کر جارہا ہے''۔

مگر ڈائر نے ہڈی کو پھر دانتوں اور پنجوں سے بھبھوڑا۔ ہڈی ٹوٹ گئی اور کتے کے دانت اس ہڈی کے اندر کے سسٹم کو متحرک کرنے میں کام یاب ہو گئے۔ یکایک زبردست قسم کا دھماکا ہوا جس میں کچھ چیخوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ جب کوٹھی کے ملازم وہاں پہنچے تو بے چارے ڈائر اور دونوں مصوروں کے ٹکڑے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے!

کنول گاڑی لے کر فرار ہو چکی تھی۔

لالچ لے ڈوبا

محمد معروف چشتی

آدھی رات کا وقت تھا۔ خالد صاحب کا تمام گھر سویا ہوا تھا۔ مگر ان کے اسٹور روم میں بڑی رونق تھی۔ چھوٹے بڑے کئی چوہے بھاگے پھر رہے تھے۔ کوئی ادھر جا رہا ہے تو کوئی ادھر۔ چوہیاں زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھیں جب کہ چوہے کھانے کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔ کیوں کہ آج چمنی کا ولیمہ تھا۔

چمنی بڑا پیارا اور خوب صورت چوہا تھا مگر چوں کہ اس کی پیدائش پرانے غیر استعمال شدہ باورچی خانے کی چمنی میں ہوئی تھی اس لیے اس کے والدین اسے چمنی ہی کہتے تھے۔ کل اس کی شادی خالد صاحب کے پڑوسیوں کے چوہوں کے گھر ہو گئی تھی اور آج اس کے گھر دعوت ولیمہ تھی۔ وہ اپنی آٹھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اس لیے تمام خاندان والے پورے زور و شور سے اس کی شادی کی خوشیوں میں شریک تھے۔ سب بہنوں نے مل کر بل کو کھود کھود کر وسیع کر لیا تھا تاکہ مہمانوں کو بٹھانے میں آسانی رہے۔ خالد صاحب کا گھر ویسے تو پکا تھا مگر اسٹور روم ابھی تک کچا تھا جہاں چوہے خوب موجیں منا رہے تھے۔

بل کی صفائی ہو گئی تو چمنی کے کزنوں نے کھانا لگانا شروع کر دیا۔ چمنی کی بہنیں دوڑ دوڑ کر سجاوٹ کی اشیاء سے بل کو سجا رہی تھیں۔ ایک بہن بھاگ کر خالد صاحب کی چھوٹی بیٹی گڑیا کے کمرے میں گئی اور اس کے گڈے کی واسکٹ اپنے بھائی کے لیے اٹھا لائی۔ چمنی کے دادا جو کافی بوڑھے ہونے کی وجہ سے بیمار تھے اور بل کے ایک کونے میں لیٹے آرام کر رہے تھے، چھوٹی چوہیا کی حرکت دیکھ کر بولے۔

"اری بٹیا، یہ کس کے کپڑے اٹھا لائی ہو؟ کیوں دوسروں کی چیزیں چوری کرتی ہو۔ چوری کرنا بری بات ہے۔ اس ویسٹ کوٹ کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا"۔

مگر کسی نے ان کی ایک نہ سنی اور سب اپنے اپنے کاموں میں مگن رہے۔ چمنی کی سب سے چھوٹی بہنیں تو سب سے پہلے تیار ہو کر بس دلہن کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھیں اور بھابھی کے شوق میں کسی سے مل ہی نہیں رہی تھیں۔ ان کی اور بھی بہت سی سہیلیاں آ گئی تھیں۔ چمنی کی ماں نے اپنی ایک بیٹی کو بلا کر کہا۔

"بدنو تم ایسا کرو کہ گڑیا کے کمرے میں جاؤ اور اس کے گڈے کا سہرا اٹھا لاؤ۔ وہ ہم بل کے دروازے پر لٹائیں گے تو مہمان دیکھ کر بہت خوش ہوں گے"۔

بدنو یہ سنتے ہی سہرا لینے دوڑ پڑی۔ دادا نے سنا تو کہنے لگے۔

"اری بٹیا، کیوں لالچ کرتی ہو۔ ہمارا گھر تو پہلے ہی اتنا اچھا لگ رہا ہے"۔

"ابا جی ایک ہی تو بیٹا ہے ہمارا، اس کے بھی ارمان پورے نہ کریں تو اور کس کے کریں"۔ چمنی کی ماں نے جواب دیا اور کام میں لگ گئی۔ اتنے میں چمنی کا باپ آ کر چمنی کی ماں سے کہنے لگا۔

"بیگم، بیگم جلدی آؤ میرے ساتھ، میں نے باورچی خانے میں کافی سارا گڑ دیکھا ہے۔ مگر وہ مجھ اکیلے سے اٹھایا نہیں

جائے گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو"۔

اور دونوں میاں بیوی گڑ اٹھا کے لے آئے۔ دادا نے کھانس کر کھنکار ایک طرف پھینکی اور ناک پر عینک جما کر بولے۔

"ارے بچو، تم سے صبر کیوں نہیں ہوتا۔ اتنا لالچ نہ کرو۔ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ تھوڑے پر صبر کرو"۔

"ابا جی ایک چمنی ہی تو ہمارا بیٹا ہے پھر بھلا کب ایسا موقع آئے گا؟ اور ویسے بھی لوگوں کو پتا چلنا چاہیے کہ ہم کھاتے پیتے گھر کے چوہے ہیں کوئی غریب گھر کے نہیں" چمنی کے ابا جان نے کہا۔

والدین کی طرف سے بے جا آزادی ملنے پر چمنی کی بہنیں شیر ہو گئیں اور وہ بیگم خالد کے کمرے سے ان کی لپ اسٹک گھسیٹ کر لے آئیں۔ جسے لگا کر سب چوہیاں خوب بن ٹھن گئیں۔ چمنی کا باپ اپنی بیوی سے بولا۔

"بیگم میں ذرا انتظامات کا جائزہ لے لوں۔ مہمانوں کی آمد کا وقت ہو گیا ہے۔ تم ایسا کرو کہ خالد صاحب کے منے کا باجا اٹھالاؤ۔ مہمانوں کی آمد پر جب ہم باجا بجا کر ان کا استقبال کریں گے تو سب حیران رہ جائیں گے۔ آخر انہیں پتا چلنا چاہیے کہ میرے بیٹے کی شادی ہے، کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کی نہیں"۔

چمنی کی ماں لپک کر گئی اور جھپک کر باجا اٹھا لائی۔ مگر اب کے دادا کچھ نہ بولے۔ شاید وہ سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے اور انہوں نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔

تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ بل اچھی طرح سج گیا۔ دلہا بھی تیار ہو گیا۔ کھانا بھی لگ گیا۔ سب نے رنگ برنگ کے کپڑے پہن لیے۔ اتنے میں ایک چوہے نے آکر خبر دی کہ مہمان آرہے ہیں۔

چمنی کا باپ فوراً باجا ہاتھ میں لیے بل کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ جیسے ہی مہمان نظر آئے اس نے باجا بجانا شرع کر دیا۔ آدھی رات کا سکوت ٹوٹ گیا۔ باجے کی تیز آواز فضا میں گونجی تو بی مانو کو بھی جاگ آگئی۔ اس نے برآمدے سے نکل کر اسٹور میں جھانکا تو اتنے سارے چوہے دیکھ کر رک حیران رہ گئی۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور چوہوں کے سر پر جا پہنچی۔ تمام چوہے چیختے چلاتے ادھر ادھر بھاگ گئے مگر چمنی کا لالچی باپ بی مانو کے قابو میں آگیا۔ اس نے بھاگنے کی بہت کوشش کی مگر وہ بی مانو کے پنجوں سے آزاد نہ ہو سکا۔ بی مانو نے اس کی تکا بوٹی کر دی۔

دراصل وہ بی مانو کے پنجوں میں نہیں پھنسا تھا بلکہ لالچ جیسی بری بلا کے پنجوں میں پھنس گیا تھا۔

Sharjeel Ahmed

بزرگ بچے

مجیب ظفر انوار حمیدی

اسلامیات کی استانی نے بتایا "پیارے بچو! بچہ اور بوڑھا طبیعت کے لحاظ سے برابر ہوتا ہے۔ جو بچہ بچپن میں چاہتا ہے وہی ایک بوڑھا بڑھاپے میں چاہتا ہے۔ ہمیں بزرگوں کا خیال رکھنا چاہیے"۔

گھر آکر ہم نے محترمہ باجی صاحبہ کو تمام بات بتلا دی بلکہ ایسی دل دوز تقریر کی کہ نرم دل باجی صاحبہ کی چنی منی آنکھوں میں چنے منے آنسو آگئے۔ باجی نے جذبات کے سمندر میں خطرناک سوئمنگ کرتے ہوئے فوراً اپنی رف کاپی سے ایک صفحہ پھاڑا اور اس پر پوائنٹس لکھنا شروع کیے کہ آخر بزرگ افراد کا دل کس طرح بہلایا جاسکتا ہے؟ بچے اپنے بڑوں کا خیال کس طرح رکھ سکتے ہیں؟...... طے یہ پایا کہ جس طرح بچے اپنے کام بڑوں سے پوچھ کر کرتے ہیں اسی طرح بڑے بھی اپنے کام بچوں سے پوچھ کر کریں گے (کیوں کہ بڑھاپے میں وہ ایک بچہ جیسے ہیں)

اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا گیا اور دادا جان محترم کا "انتخاب پہلے زیر نگرانی بزرگ" کے طور پر ہوا۔ بھائی جان کا کہنا تھا کہ ابو جانی بھی بزرگ افراد ہی میں شمار ہوں گے اور پھر دادا جان محترم کے غصے سے ڈر بھی لگ رہا ہے کیوں کہ اگر دادا جان کا خیال رکھنے کے دوران میں کوئی غلطی ہو گئی تو نہ صرف دادا بلکہ ابو سے بھی ٹھکائی لگے گی، چناں چہ کابینہ کے ہنگامی اجلاس میں شخصیت کو فوراً تبدیل کر دیا گیا اور ابو جان کا انتخاب کر لیا گیا۔ اب جناب...... ابو جان ہمارے منتخب کردہ بزرگ تھے جو اپنے گھر سے تمام ووٹ لے کر اپنا خیال کروانے میں کام یاب ہوئے تھے۔

منصوبے کے پہلے نکتے پر عمل در آمد شروع ہوا اور اگلے دن سے ہم چاروں بہن بھائیوں نے ابو جان کی سختی سے نگرانی شروع کر دی بلکہ احتیاط کے طور پر اپنے دوستوں سے بھی کہہ دیا کہ یارو! ہمارے بزرگ ابو کا خیال رکھنا اب یہ بھی بچہ ہی ہیں۔ سارے بچے یہ سن کر خوشی سے چھلانگیں لگانے لگے کہ ان کی ٹیم میں اتنے مال دار نئے دوست کا اضافہ ہوا ہے۔ سب کو روزانہ ٹافیاں، ڈکار چورن، رنگی ہوئی چھالی، املی کی مٹھائی اور دوسری فضولیات ملنے کا یقین ہو گیا۔ انہوں نے چیخ کر کہا! "تم لوگ فکر نہ کرو، تمہارے بچہ ابو ہمارے بھی بچے ہیں، ہم ان کا پورا پورا خیال رکھیں گے"۔ ان بزرگوں سے "معاہدہ والد" کر کے ہم خوشی خوشی گھر واپس آگئے۔

ابو جان پانچ مرغیاں ذبح کرا کے لائے تھے۔ بھائی جان نے ایک نگاہ ڈھیروں ڈھیر مرغی کے گوشت پر ڈالی اور خوف سے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ابو سے کہا! "آپ کو ہم بہن بھائیوں سے مشورہ کر کے مرغی لانی چاہیے تھی۔ ابو جان اتنے سارے پیسے خرچ کر دیئے، دو لے آتے۔ باقی پیسے منی کے نئے جوتوں میں کام آتے"۔

ابو جان پہلے تو حیران پریشان بھائی جان کا چہرہ تکتے رہے

پھر گرجتے ہوئے فرمایا! "کیا کہا؟ میں کھاؤں گا آٹھ کلو گوشت اکیلا؟ تم لوگوں کے لیے لایا ہوں' اف میرے اللہ مرغ ڈھیر ہے اور تم لوگ ڈھیڑ ہو" اتنا کہ کر ابو امی کو بلانے کے لیے اندر چلے گئے۔ بجائے خوش ہونے کے ہم سب کے منہ لٹک گئے۔ "ڈھیڑ" کے مطلب پر غور بھی نہ کیا۔ اس واقعہ سے بھائی جان تو ہمت ہارنے والے تھے مگر باجی نے ان سے کہا:

"منیب بھائی! ہمت مت ہارنا' ابھی تو آغاز ہے۔ ابھی ابو نئے نئے بچہ ہوئے ہیں' ضد تو کریں گے شروع شروع میں"۔

اگلے دن ابو دفتر سے آتے ہی امی پر برسنے لگے۔ امی اس نئی آفت سے پریشان ہو گئیں "کیا بات ہے کیوں چیخ رہے ہیں؟ بچے پاگل سمجھیں گے" امی نے بریانی کے لیے چنے چاولوں کا تھال میز پر پٹختے ہوئے پوچھا۔

"میں پاگل ہوں...... بیگم میں پاگل ہوں یا وہ آٹھ دس بدتمیز' بد تہذیب بچے پاگل ہیں جو آپ کی چہیتی اولاد کے دوست ہیں۔ میں دفتر سے ضرورت کی چیزیں لے کر آرہا تھا کیوں کہ کل اتوار ہے' بازار دیر سے کھلے گا' منی کے نئے جوتے بھی تھے' باہر گلی میں رکشے سے اترتے ہی ان بچوں نے چیخیں مارتے ہوئے میرے سارے تھیلے چھین لیے اور کہنے لگے کہ انکل آپ بچے ہیں' کیوں اتنے پیسے خرچ کیے آپ نے؟ رکشے سے کیوں آئے؟ پیدل آئے ہوتے۔ آپ کو بس ٹافیاں' چیونگم اور سپاری لانی چاہیے تھے۔ میں پوچھتا ہوں یہ کیا تماشا ہو رہا ہے گھر میں؟ بلاؤ اپنی اولاد کو!"

ابو کا بلاوا آیا تو زین بیٹھ گیا۔ ہم سب ابو کی آوازیں سن چکے تھے۔ سب کے چہرے فق تھے۔ ابو بہت زیادہ بچہ ہو چکے تھے۔

"چلو زین...... اٹھو...... اللہ مالک ہے...... چلو ابو کے پاس!" باجی صاحبہ نے اکڑے ہوئے زین کو کھینچا۔

"نہیں...... نہیں...... نہیں نا...... چھوڑو مجھے" وہ بے بسی سے رو دیا۔

غرض قصہ بہت ہی مختصر...... ابو جان نے پوری بات سن کر قہقہے لگاتے ہوئے ہم آنسو بہاتے ہوئے "بزرگوں" کو معاف کر دیا اور سمجھایا! "میری اور تمام بزرگوں کی خدمت کر کے دعائیں بھی کمانی چاہئیں' لیکن خدارا...... خدمت کا صحیح مفہوم سمجھ کر۔ بچوں کا بڑاپن یہ ہی ہے کہ وہ اپنے بڑوں کو اپنے سے چھوٹا جان کر ان کی مدد کریں۔ کڑی نگرانی نہیں...... ہاہاہا...... ہاہا ہا...... بھئی تم لوگ تو واقعی ابھی تک بالکل بچے ہی ہو"۔

ابو نے "بچے" پر زور دیتے ہوئے ہمارا انداق اڑایا۔

اب تو یوں لگتا ہے کہ محترم بزرگوں کی خدمت کرنے سے پہلے ان سے پوچھنا پڑے گا "معاف کیجئے گا ایک بات تو بتلا دیجیے' آپ بزرگ ہیں یا بچہ؟ آپ کو نصیحت کر دیں' برا تو نہیں منائیں گے جناب؟ آپ کا اپنا فائدہ ہے...... ہمارا کیا؟"

(ڈھیڑ: کوا' ہندوؤں کی ایک نیچ قوم۔ چمار' احمق' بے وقوف)

نرالے میاں چلے رسے پر
کارٹون کہانی
شاہد ریاض شاہد
نرالے میاں ٹی وی میں رسے پر چلنے کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے سوچا
واہ! کاش، میں بھی رسے پر اس طرح چل سکوں
اتنے میں لبو جی ملک صاحب اور گنجو میاں کپڑے کا ایک بینر لے کر آئے اور نرالے میاں سے کہا
بھائی جان، ذرا باہر جاکر اس کو لٹکا دیں
نرالے میاں نے رسی لی، اس کا ایک سرا ہمسائے کے گھر اور دوسرا اپنے گھر کی چھت پر باندھا
لو جی یہ لگ گئی گرہ
رسی باندھنے کے بعد نرالے میاں کو ٹی وی پروگرام یاد آگیا اور وہ سوچنے لگے
کیوں نہ بینر لٹکانے سے پہلے اس رسی پر چلا جائے

اور پھر انہوں نے اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنایا اور رسی پر چلنے لگے
واہ جی واہ ہم بھی چل سکتے ہیں رسی پر
مگر آدھے راستے میں جا کر نرالے میاں بوکھلا گئے اور لگیں ان کی ٹانگیں کانپنے
یااللہ خیر یااللہ خیر
اور پھر جب ٹانگیں کانپنے لگیں تو نرالے میاں کا توازن خراب ہو گیا اور وہ پھسل پڑے
لمبو...... گنجو...... ملک...... آؤ...... آؤ بھاگو...... بھاگو
اس کے بعد نرالے میاں کا قسمت نے ساتھ دیا اور وہ نیچے گرنے کے بجائے اوپر رسی میں ہی پھنس گئے اور باقی لوگ بھی وہاں آن پہنچے
بھائی جان
آپ نے تو بینر لٹکانا تھا مگر خود ہی لٹک گئے

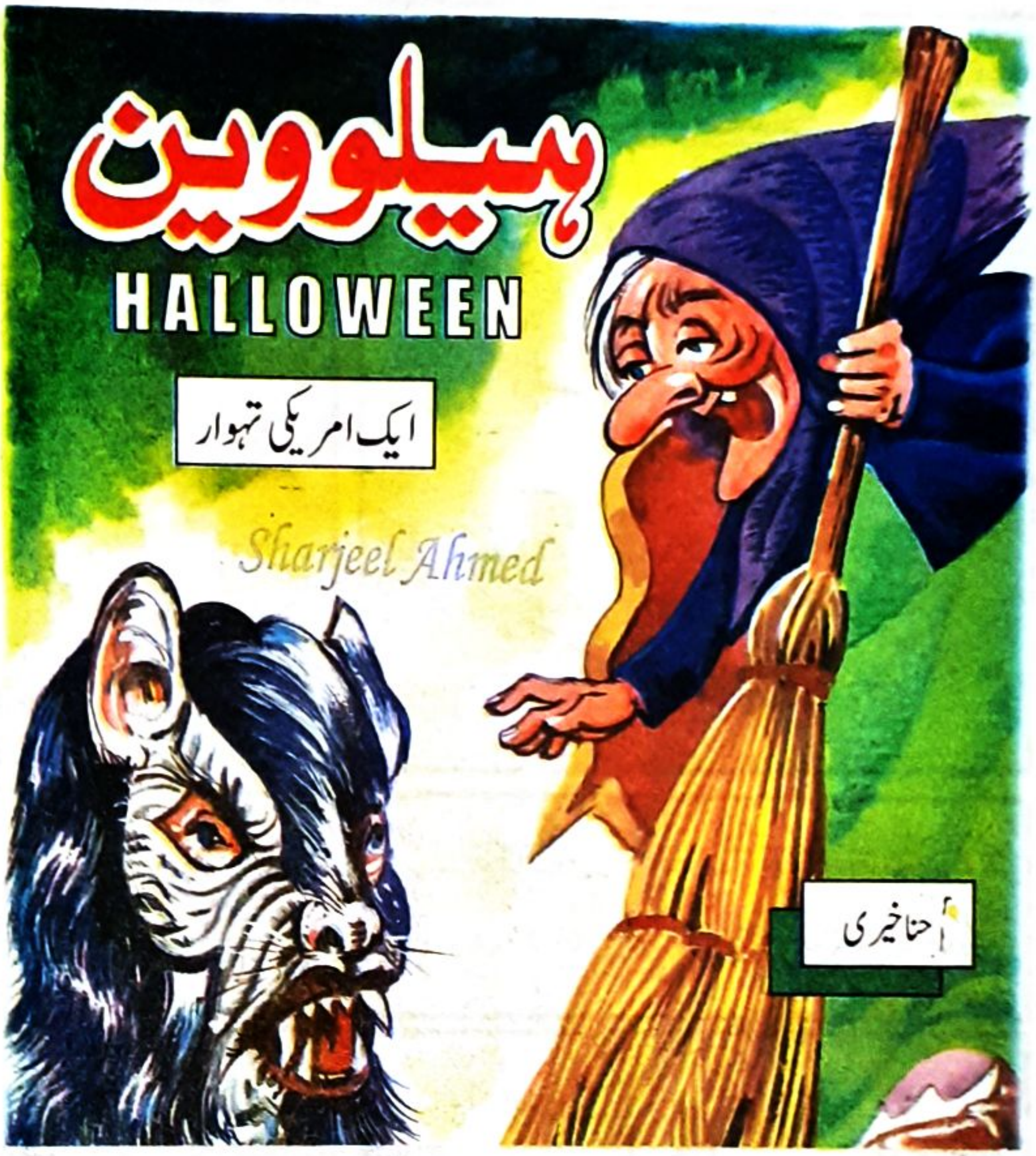

ہیلووین

HALLOWEEN

ایک امریکی تہوار

حنا خیری

ہر سال امریکی 31 اکتوبر کو ہیلووین کا تہوار مناتے ہیں۔ جو دراصل موسم خزاں یعنی پت جھڑ کا تہوار ہے۔ اس تہوار کی شروعات یورپ سے ہوئی اور 1840ء میں اسے آئرلینڈ کے لوگوں نے امریکا میں متعارف کرایا۔ اس تہوار کی ابتدا کچھ اس طرح سے ہوئی کہ پرانے زمانے میں یورپ کے باشندے یہ سمجھتے تھے کہ گزرے ہوئے سال مرنے والوں کی بھٹکتی روحیں زندہ لوگوں کی تلاش میں نکلتی ہیں تاکہ ان کے اجسام پہ قابو پا سکیں۔ اس سے بچاؤ کا ان کے نزدیک صرف ایک ہی راستہ تھا۔ لہٰذا 2 نومبر کو وہ روحوں کا دن منانے لگے۔ وہ گلی گلی گاؤں گاؤں گروہوں کی شکل میں روحوں کے کیک (Soul Cakes) کی تلاش میں نکلتے جو ڈبل روٹی و کشمش کے بنے ہوئے چوکور ٹکڑے ہوتے تھے۔ گھر گھر جا کے وہ یہ کیک مانگتے۔ جتنے زیادہ کیک انہیں ملتے اتنی ہی زیادہ دعائیں وہ دینے والے کے مرے ہوئے رشتہ داروں کے حق میں کرتے۔

اس وقت یہ یقین عام تھا کہ مرنے کے بعد اور جنت میں جانے سے پہلے روحیں کچھ عرصہ ایک طرح کے خلا میں رہتی ہیں اور دعائیں ان کو جلد از جلد جنت تک پہنچا دیتی ہیں۔ آئرلینڈ کے لوگ روحوں کو ڈرانے کے لیے طرح طرح کے خوف ناک لباس پہنتے اور شور مچاتے ہوئے گلی کوچوں میں پھرتے۔ رفتہ رفتہ یہ رسم ایک تفریح کی حیثیت اختیار کر گئی اور آج کل امریکا میں اسے ایک تفریحی رسم یا ایک دل بہلانے والے تہوار کی حیثیت حاصل ہے۔

اس تہوار میں بڑے اور بچے یکساں شریک ہوتے ہیں البتہ زیادہ تعداد بچوں کے علاوہ نوجوانوں کی ہوتی ہے جنہیں بھیس بھیس کے سوانگ بھرنے اور دوسروں کو ڈرانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔

ہیلووین کے کچھ مخصوص سمبل یعنی نشان ہیں جیسے چمگادڑیں جن کا تعلق خون پینے والے بھوت (ویمپائر Vampire) سے ہوتا ہے کالی بلی جسے جادو اور جادو گرنیوں کا ایک روپ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح آگ کا روشن الاؤ جسے بون فائر (Bon fire) کہتے ہیں بھی ہیلووین سے تعلق رکھتا ہے جسے نہ صرف روحوں کو بھگانے کے لیے جلایا جاتا ہے بلکہ اس کے گرد لوگ اکٹھے ہوتے اور ملتے ملاتے بھی تھے۔ اسی طرح جادو گرنیوں' جادو گرنیوں کی جھاڑو دیں جنہیں بروم (Broom) کہتے ہیں اور جن پہ وہ سفر کرتی ہیں'

طرح طرح کے خوف ناک لباس اور چہرے پہ لگائے جانے والے ماسک جو روحوں کو ڈرانے کے لیے لگائے جاتے ہیں' بھوت پریت' قبرستان' ڈھانچے' جیک او لینٹرن (Jack-o-lantern) جو دراصل ایک نارنجی رنگ کا کدو ہوتا ہے جس میں آنکھ ناک اور منہ گودے جاتے ہیں اور اس کے اندر کا گودا نکال کر موم بتی یا کوئی دوسری روشنی رکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ چاند جس کی لہریں پاگل پن پہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ بھیڑیے جنہیں Were Wolf کہا جاتا ہے' ان سب چیزوں کو اس موقع پہ مختلف جگہوں پہ سجایا جاتا ہے یا ان کی تصاویر لگائی جاتی ہیں۔

ہیلو وین کا نام آتے ہی ٹرک یا ٹریٹ (Trick Or Treat) کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ بچے سارا سال اس تہوار کا انتظار کرتے ہیں کہ کب ہیلو وین آئے اور کب وہ ٹرک یا ٹریٹ کے لیے نکلیں۔ جتنی زیادہ ٹافیاں اور چاکلیٹ اس زمانے میں بکتے ہیں اتنے سارے سال میں نہیں بکتے۔ روحوں کے کیک (Soul Cakes) کے بجائے بچے اور بڑے گھر گھر جا کر ٹرک یا ٹریٹ کی فرمائش کرتے ہیں۔

اس دن کی تیاریاں خوب زور و شور سے کی جاتی ہیں۔ ہیلو وین کی آمد سے بہت پہلے ہی دکانوں' اسٹوروں میں ہیلو وین سے متعلق اشیاء شیلفوں میں سج جاتی ہیں۔ ان میں طرح طرح کے لباس 'مختلف طرح کے ماسک' ہیٹ' ٹوپیاں' لوگوں کو ڈرانے کی عجیب و غریب' خوف ناک' پر ہول اور گھناؤنی چیزیں سب شامل ہیں۔ اس موقع پہ پہننے کے لیے بہت سے بچے اور بڑے نئے لباس خریدتے ہیں۔ رنگ رنگ کے سوانگ رچاتے ہیں' طرح طرح کے بھیس بدلتے ہیں۔ سر شام ہی لوگ گھروں کے باہر روشنی جلا کے ٹافیوں اور چاکلیٹوں کے تھال لیے آنے والوں کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جس گھر کا دروازہ بند ہو اور جہاں سے روشنی بھی نہ آ رہی ہو وہاں کوئی نہیں جاتا۔ اس رات کو (Beggars Night) یعنی بھیک منگوں یا مانگنے والوں کی رات بھی کہا جاتا ہے۔

شام چھ یا ساڑھے چھ سے آنے والوں کا تانتا سا بندھ جاتا ہے۔ لوگ صرف اپنے محلے یا قریب کی گلیوں میں چکر لگاتے ہیں۔ کوئی پیاری سی بچی پری بنی' ایک شہزادی بنی' کوئی کسی مشہور فلم کا کوئی کردار بنا پھرتا ہے۔ ویسا ہی لباس پہنے جیسے سپر مین' کیٹ مین' بز لائیٹر (Buzz Lightyear) یا وڈی (Woody) تو کوئی کتابلی بنا ہوتا ہے۔ چہرے پہ مونچھیں بنی ہوتی ہیں۔ کوئی مسخرے کا روپ دھارے ہوتا ہے۔ رنگ برنگے بال کیے' پکوڑا سی سرخ ناک کیے' چہرے پہ رنگ رنگ کی دھاریاں بنائے تو کوئی لمبا سا کالا ہیٹ پہنے کالا چغہ پہنے' ربر کی لمبی سی ناک لگائے جادوگرنی (Witch) کے سوانگ میں ہوتا ہے' کوئی ڈھانچے کا ماسک لگائے چغہ پہنے ڈھانچہ بنا پھرتا تو کوئی سرخ سرخ ہونٹ کیے خون آشام او یمپائر بنا ہوتا ہے۔ کوئی لمبی

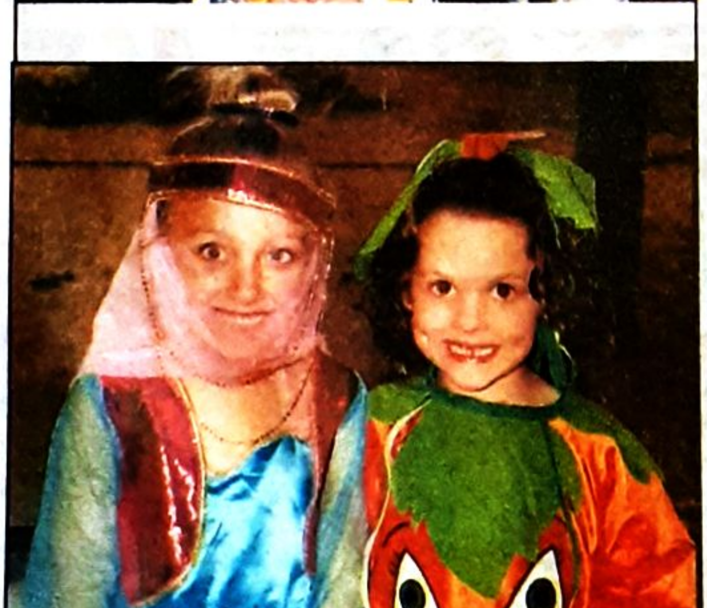

سی دم لہراتا ہوا مگر مچھ بنا ہوتا ہے تو کوئی منہ پہ دھاریاں یا چکتے لگائے شیر یا چیتے کے سے لباس میں پھرتا ہے۔ سب کے ہاتھوں میں طرح طرح کے کشکول ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچے عموماً اپنے ماں باپ یا بڑے بھائی بہنوں کے ہم راہ ہوتے ہیں اور نوجوان پارٹی عموماً الگ گھومتی ہے۔

ان کے روپ اور طرح طرح کے سوانگ بڑے دل چسپ معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ واقعی اتنے ہیبت ناک اور خوف ناک ہوتے ہیں کہ دیکھ کر ہی ڈر محسوس ہوتا ہے۔ چھوٹے بچے

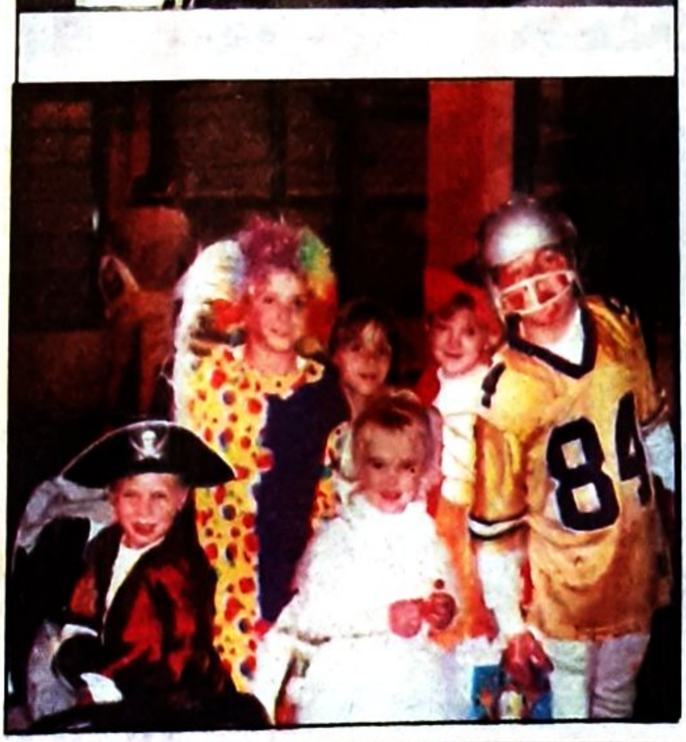

طرح طرح کے لباسوں میں بڑے پیارے لگتے ہیں۔ آتے ہی یہ لوگ ٹرک یا ٹریٹ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ ہمیں کوئی شعبدہ، کوئی جادو نہیں دکھا سکتے تو پھر کوئی ٹریٹ دیں۔ یہ ایک رسم ہے۔ شعبدہ یا جادو تو کوئی بھی نہیں دکھاتا سب ٹریٹ یعنی ٹافیاں اور چاکلیٹ وغیرہ ہی دیتے ہیں۔

اکثر لوگ اپنے گھروں کو اس موقع کے لیے سجاتے ہیں۔ کہیں مکڑی کے مصنوعی جالے تنے دکھائی دیتے ہیں جو دیکھنے میں اصل لگتے ہیں۔ کہیں چمگادڑیں الٹی لٹکتی رہتی ہیں۔ کہیں گھاس پھونس اور تنکوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں، ساتھ میں نارنجی کدو یا جیک او لالٹین رکھے ہوتے ہیں۔ بعض بڑے بچوں کے ٹرک یا ٹریٹ کے استقبال کے لیے کوئی بھیس بدل کر بیٹھتے ہیں۔

ہیلووین کے زمانے میں ٹی وی پہ ڈراؤنی و خوف ناک فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ کلبوں و مختلف جگہوں میں تفریح کی غرض سے طرح طرح کے شو کیے جاتے ہیں جہاں لوگ ٹکٹ لے کر محظوظ ہونے جاتے ہیں۔ ڈراؤنے وخوف ناک مجسمے نیز پراسرار چیزیں سجا کر ماحول پر ہول اور ہیبت ناک بنایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی خوف ناک دل دہلا دینے والی آوازیں بھی لگائی جاتی ہیں۔ کہیں قبرستان کا منظر پیش کیا جاتا ہے، کسی کھلے تابوت میں کوئی مردہ لیٹا دکھائی دیتا ہے، درختوں سے چمگادڑیں لٹک رہی ہوتی ہیں، کہیں کوئی ویمپائر دانت نکالے آپ کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے، کہیں ڈھانچے ہلتے نظر آتے ہیں، کہیں کوئی جادوگرنی اپنے جھاڑو پر بیٹھی نظر آتی ہے اور پس منظر میں اس کا خوف ناک قہقہہ گونجتا ہے، کہیں کسی درخت کی شاخ پہ کوئی الو بیٹھا آپ کی طرف گردن گھماتا اور آنکھیں پٹپٹاتا ہے۔ غرض جو کچھ امریکیوں سے بن پڑ سکتا ہے اس موقع کو دل چسپ رنگین اور پر لطف بنانے کے لیے وہ کر گزرتے ہیں اور ہر سال ہیلووین کا تہوار پورے جذبے اور جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ ہیلو وین گزر جانے کے بعد بچے دوبارہ بڑی شدت سے اگلے سال کا انتظار شروع کر دیتے ہیں کہ کب دوبارہ ہیلووین کا تہوار آئے اور وہ ٹرک یا ٹریٹ منانے سڑکوں پر نکلیں۔

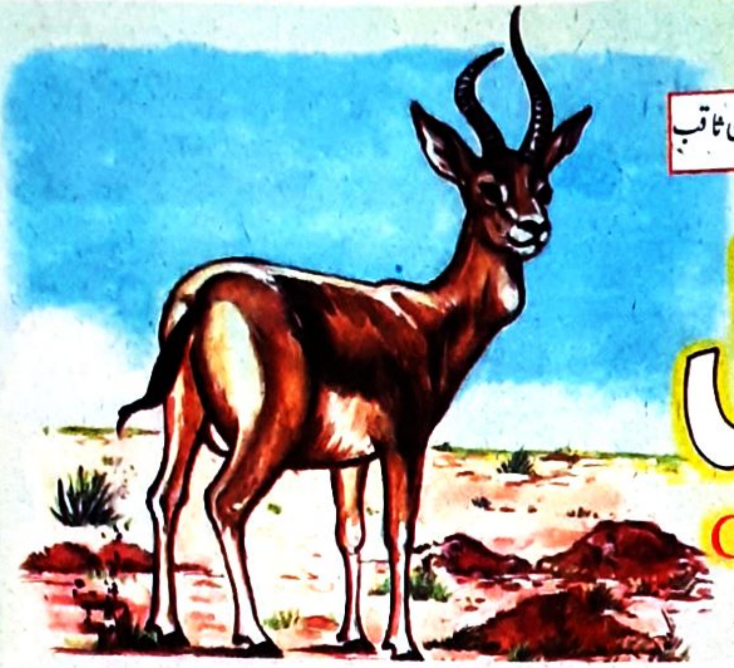

ڈاکٹر رضوان ثاقب

گلہڑ دار غزال

Goitred Gazelle

اس ہرن کے گلے میں ایک گلہڑ نما ابھار ہوتا ہے۔ سینگ نوک کے قریب ایک دوسرے کی طرف بہت حد تک مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ البتہ مادہ گلہڑ دار غزال میں سینگ نہیں ہوتے بلکہ ان کی جگہ بالوں کے دو گچھے ہوتے ہیں۔

گلہڑ دار غزال بہت بنجر علاقوں میں رہتا ہے۔ اسے خوراک حاصل کرنے کے لیے بہت لمبے فاصلے طے کرنا پڑتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے ٹولوں میں سفر کرتے ہیں۔ سفر کے دوران میں یہ ڈرے ڈرے اور ہوشیار و محتاط رہتے ہیں۔ کیوں کہ انسان ان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اسی خوف سے یہ بے چارے صرف صبح سویرے یعنی منہ اندھیرے اور شام کے وقت ہی غذا کے لیے کھلے علاقوں میں نکلتے ہیں جب کہ باقی سارا دن چھپے رہتے ہیں۔ بنجر علاقوں میں جہاں کہیں گھاس یا جنگلی جھاڑیاں میسر آ جائیں انہی پر گزارہ کر لیتے ہیں اور اگر انہیں کہیں سرسبز و شاداب یعنی رس بھرے پتوں والی جھاڑیاں مل جائیں تو یہ پانی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ گلہڑ دار غزال کا رہائشی علاقہ چوں کہ بنجر ہوتا ہے اس لیے موسم گرما میں جب بارش نہیں ہوتی تو ان کے علاقے میں تمام پودے جھلس جاتے ہیں۔ یہ ان جھلسی سوکھی جھاڑیوں اور گھاس پھونس سے ہی اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں مگر خشک چارا کھا کر انہیں پانی کی طلب ہوتی ہے۔ لہٰذا پیاس بجھانے کے لیے یہ پانی کی تلاش پر مجبور ہو جاتے ہیں اور عام طور پر اس صورت حال میں ہی یہ انسانوں کے ہاتھوں شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر انہیں پریشان نہ کیا جائے تو یہ تیز دھوپ میں کھلے عام پھرتے رہتے ہیں اور سائے کے طلب گار نہیں ہوتے۔ بعض اوقات یہ آپس میں خوب الجھتے اور ٹکریں مارتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اس موقع پر یہ گزرتے ہوئے انسانوں پر بھی حملہ کر دیتے ہیں۔ مادہ ایک وقت میں ایک یا کبھی کبھی دو بچے دیتی ہے۔ بچے دو تین دن کے بعد ہی ماں کے ساتھ چلنے پھرنے لگ جاتے ہیں۔ ماں بچوں کو 5 ماہ کے لیے دودھ پلاتی ہے۔ بھیڑیے اور چرخ ان کے بچوں کا شکار کرتے ہیں۔

پالتو حالت میں گلہڑ دار غزال کی عمر تقریباً 15 سال ہوتی ہے۔ گلہڑ دار غزال پاکستان میں صرف بلوچستان میں نوشکی، چاغی، چمن، رزغم اور ساحلی علاقوں مکران، خاران اور قلات کے آس پاس پتھریلے صحراؤں میں ملتے ہیں۔ یہ سیدھے اونچے پہاڑوں اور فصلوں والے علاقوں سے دور رہتے ہیں۔ پاکستان میں ان کے شکار پر مؤثر پابندی نہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ شکار کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے پاکستان میں بے حد شکار کیے جانے کے باعث ان کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ پاکستان سے باہر یہ ایران، افغانستان، وسطی ایشیائی ممالک اور مشرق وسطیٰ میں بھی ملتے ہیں۔

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 اکتوبر 2001ء

ستمبر 2001ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ 6 ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

☆ طہٰ ندیم لاہور چھاؤنی (ایک کے سے دوناک آؤٹ، پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

☆ رمشا خان لاہور (اب آیا مزا نزدیک سے ٹی وی دیکھنے کا' دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)

☆ شاہ نواز انجم لاہور (یہ ہے "لائیو باکسنگ"" تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

☆ نصیر الحق اسلام آباد (آگے پاس کرو ورنہ ایک اور آیا' چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

☆ کاشف رضا فریدی ساہی وال (تمہارا کوئی قصور نہیں سکرین ہی کم زور تھی' پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)

☆ رابعہ غلام رسول لاہور (دیکھائی وی لائسنس نہ بنوانے کا انجام' چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

NO. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

ILLUSTRATED FS CLASSICS

ILLUSTRATED CLASSICS

السٹریٹڈ کلاسکس

فیروز سنز نے پہلی بار ایسے تصویری کلاسکس کا دلچسپ سلسلہ شروع کیا ہے جس میں رنگا رنگ تصویروں کے ذریعے نامور ہیروز HEROES کے کارنامے پیش کیے جاتے ہیں۔ بچے یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی مزیدار فلم دیکھ رہے ہوں۔ بچوں کے علاوہ بڑے بھی ان تصویری کلاسیکوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

محمد بن قاسم ★ ٹیپو سلطان ★ شیر شاہ سوری

یہ تینوں کلاسکس چھپ چکے ہیں

اس کے علاوہ دوسرے ہیروز HEROES پر کام ہو رہا ہے۔

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی کراچی

خود پڑھیے۔ تحفہ میں دیجئے

قیمت فی کلاسک : -/۴۰ روپے

چوہدری امانت علی اینڈ سنز رحیم یار خان ☎ 72626